جگر مراد آبادی کی سوانحِ حیات

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

(پی ڈی ایف کنورٹنگ : غلام مصطفیٰ دائمؔ)

اِس کے سوا اُس میں کوئی خوبی نہیں تھی کہ وہ دوسر ے بچوں کے مقابلے میں خوش خط تھا. بلکہ اُن بچوں سے اُس کا کوئی مقابلہ تھا ہی نہیں. اُسے تو بلا شبہ ایک اچھا خطاط کہا جا سکتا تھا. جس عمر میں بچے تختی لکھتے ہیں، وہ خطِ نستعلیق سے خطِ ماہی تک ہر خط پہ حاوی ہو چکا تھا. وہ اپنی کاپیوں پر دوسروں کے اشعار اپنے خوبصورت خط میں تحریر کرتا رہتا تھا.

.

یہ اُس کی انفرادیت تھی. مولوی معین الدین اُس کی اِس خوبی کے قدردان بھی تھے لیکن کتابوں سے عدم دلچسپی اُن کے لیے ناقابلِ برداشت بھی تھی.

"کمبخت تُو اُس خاندان سے متعلق ہے جس کے ایک فرد مولوی سمیع اللہ شاہ، بادشاہِ دہلی فرغ سیر کو حدیث پڑھاتے تھے اور تُو کتابوں کا ایسا چور!"

.

اُسے یہ طعنے روز سُننے کو ملتے تھے لیکن اُس کا دل کتابوں کی طرف راغب ہی نہیں ہوتا تھا. والد کے ڈر سے اُردو اور فارسی کی جو کتابیں اُس نے گھر پڑھ لی تھیں، بس وہی اُس کا علمِ کُل تھا. جبکہ اُس کے اُستاد یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی ذہانت کو ضائع کر رہا ہے. اگر ذرا سی کوشش کر ے تو بہت بڑا عالم بن سکتا ہے. لیکن وہ ایک گھبرایا ہوا بچہ تھا جس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا. کتابوں سے تو اُسے ازلی چڑ تھی.

.

علم و ادب کے بعد اِس خاندان کی دوسری بڑی انفرادیت شاعرانہ ذوق تھا. اُس کے باپ، چچا، تایا، چچا زاد بھائی سب شاعر تھے. اِس ذوق کا کچھ حصّہ اُسے بھی ملا تھا. وہ دن بھر اپنی کاپیوں پہ تُک بندیوں کے پُھول بکھیرتا رہتا تھا.

.

اُس کا مزاج ہی نہیں، شکل و صورت بھی سب سے الگ تھی. انتہائی سیاہ رنگت، ضرورت سے زیادہ پھیلی ہوئی ناک، آنکھوں میں نمایاں زردی، اُلجھے ہوئے بال، البتہ تبسّم دل آویز تھا لیکن ہنستا بہت کم تھا.

.

اُن دنوں اُس کی دو ہی مصروفیات تھیں. اپنی کاپیوں پر اشعار لکھنے کی مشق کیا کرتا تھا یا اپنے تایا کے ایک کرایہ دار کے گھر جا کر بیٹھ جایا کرتا تھا. در و دیوار دیکھنے نہیں، کرایہ دار کی بیوی کو دیکھنے. آٹھ نو سال کی عمر تھی لیکن آنکھوں میں حُسن پرستی نے ڈیر ے جما دیئے تھے. یہ خاتون اُسے اچھی لگتی تھیں اور وہ بھی اُسے بچہ سمجھ کر خاطر تواضع میں لگی رہتی تھیں.

.

یہ اُس کے والد کی عسرت کا زمانہ تھا. وہ خاندان جس کا کبھی شاہی دربار سے تعلق تھا، اپنے زوال کے دور سے گزر رہا تھا. اِس غربت میں اُس کی اچھی تعلیم کا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا جبکہ اُسے شوق بھی نہیں تھا. اُس کے چچا علی ظفر نے حالات کو بھانپتے ہوئے اُس کی کفالت کی ذمہ داری لے لی.

.

اُس نے اِس تبدیلی کو محسوس نہیں کیا. باپ اور چچا میں فرق کیا ہوتا ہے لیکن اُس وقت وہ بپھر گیا جب چچا کا تبادلہ کروی (ضلع باندہ) میں ہوا. اُسے بھی چچا کے ساتھ جانا پڑتا. اُسے مکتب چُھوٹنے کا افسوس نہیں تھا لیکن کرایہ دار کی بیوی سے جُدا ہونے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا. ننھی سی جان کی ضد ایک ہی دن میں ٹوٹ گئی. اُسے مراد آباد کو خیر باد کہہ کر چچا کے ساتھ کروی جانا پڑا.

.

والدین تو یہیں تھے، اُس کا آنا جانا لگا رہتا تھا. وہ اُس عورت کو بُھولا بھی نہیں تھا. جب آتا اُس سے ملنے ضرور جاتا تھا لیکن ایک مرتبہ وہ مراد آباد آیا تو معلوم ہوا کہ کرایہ دار مکان چھوڑ کر چلے گئے ہیں. کس محلّے میں گئے ہیں یہ بھی کسی کو معلوم نہیں تھا. وہ بُجھ کر رہ گیا.

.

ایک دن گھر والوں کے ساتھ وہ ایک محلّے میں گیا. وہاں پہنچتے ہی اُس کی سانسوں نے بے ترتیب ہونا شروع کر دیا. اُسے محسوس ہوا گوہرِ مقصود یہیں ہے. پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اُس کا دل سہی مقام پر دھڑکا تھا. وہ خاتون اُسی محلّے میں آ کر بسی تھیں. وہ چُپ چاپ سر جُھکائے اُن کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا. گھر میں اُسے سب ہی جانتے تھے لیکن اُسے یہاں دیکھ کر سب کو ہی تعجب ہوا.

"علی سکندر، تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"آپ تو غائب ہی ہو گئی تھیں."

"جب مکان چھوڑا تو تم مراد آباد میں تھے ہی نہیں، میں بتاتی کسے؟"

وہ جب تک مراد آباد میں رہا، وہاں آتا جاتا رہا لیکن بالآخر اُسے پھر جانا پڑا.

تقریباً چار سال وہ کروی میں رہا. آخری بار وہ مراد آباد آیا تو اُس سے اپنی بے کلی دیکھی نہیں جا رہی تھی. عجب سی پریشانی تھی جس کا اُسے سامنا تھا. اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا پریشان کیوں ہے. اِس کا سبب جلد ہی اُسے معلوم ہو گیا. وہ اُس خاتون سے ملنے گیا اور ہاتھ مَلتا ہوا واپس آ گیا. اُن کا انتقال ہو چکا تھا.

.

اب اُس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اگر وہ مراد آباد میں ہوتا تو اُس کی چاہت یوں نہ مرتی. اگر انتقال ہونا بھی تھا تو اُسے بروقت معلوم ہو جاتا اور وہ اُنہیں آخری مرتبہ دیکھ تو لیتا. اُسے کروی سے نفرت ہو گئی. اُس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ کروی نہیں جائے گا.

.

خدا نے اُس کی سُن لی. اُسے مراد آباد سے کروی نہیں جانا پڑا. لیکن مراد آباد پھر بھی چُھوٹ گیا. اُس کے چچا کا تبادلہ لکھنؤ ہو گیا. اُسے بھی لکھنؤ جانا پڑا.

لکھنؤ بڑا شہر تھا. جلد ہی یہاں کی رنگینیوں نے اُس کی حُسن پرست طبیعت کو قبضے میں کر لیا. اُس کا دل یہاں لگ گیا. وہ بُھول گیا کہ کس کا ماتم کرتا ہوا وہ مراد آباد سے لکھنؤ آیا تھا.

.
اُس کے چچا نے اُسے مشن ہائی سکول میں داخل کرا دیا. جہاں وہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے لگا.
یہاں آ کر بھی اُس کا حال وہی رہا. کتابوں سے اُسے کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں. وہ تو اِس بات کا قائل تھا کہ

کتابوں میں دھرا ہی کیا ہے حافظ؟؟
سبق لے زندگی سے زندگی کا!

.
وہ زندگی کو نچوڑتا پھر رہا تھا. لکھنؤ کی تفریح گاہیں اُس کے قدموں سے آباد ہو گئیں. دوستوں کی ٹکڑی کو لے کر باغوں اور پارکوں میں گھومتا پھرتا تھا. لکھنؤ کے ادبی ماحول میں اُس کے شاعرانہ ذوق نے بھی ترقی کی تھی. کچھ ایسے دوست بھی مل گئے، وہ اُس کی طرح تُک بندی کر لیا کرتے تھے. جب یہ شوق زیادہ بڑھ گیا تو سیر سپاٹے کی فرصت بھی جاتی رہی. دن دن بھر مشقِ سُخن میں مصروف رہتا. اُس کا خدا داد ترنّم اور شعر گوئی کی فطری اہلیت اُس کے ساتھیوں کو حیران کر دیتی تھی.

اُس کے والد غالب کی شاعری کے پرستار تھے. اُن کے اثر سے وہ بھی غالب کو پسند کرنے لگا تھا. جبکہ تایا فارسی کے شاعر قتیل کے قائل تھے. اُن کے اثر سے اُن کے بیٹے محمد احمد بھی قتیل کے حق میں دلیلیں دیتے تھے.
ایک دن محمد احمد اور اُس کے درمیان زور دار بحث ہوئی. محمد احمد نے قتیل کی فارسی دانی کے اتنے قصید ے پڑھے کہ علی سکندر کو غصّہ آ گیا. اُس وقت تو وہ چُپ ہو گیا لیکن بعد میں اُس نے فارسی میں غزل کہی. مقطع میں قتیل کا تخلّص ٹانکا اور محمد احمد کے سامنے پہنچ گیا.
"آپ ٹھیک کہتے تھے. آج تو میں بھی قتیل کا قائل ہو گیا." اُس نے کہا.
"قائل تو ہونا ہی تھا. تم جیسا صاحبِ ذوق کب تک قتیل سے دور رہ سکتا تھا." محمد احمد نے کہا.
پھر کچھ سوچ کر بولے. "لیکن یہ کایا پلٹ ہوئی کیسے؟ آج کیسے قائل ہو گئے؟"
"آج مرزا قتیل کی ایک غزل نظر سے گزری، بس پڑھتے ہی قائل ہو گیا."
"کیا غزل ہے، ذرا ہم بھی تو سُنیں." محمد احمد نے خوش ہوتے ہوئے کہا.
اُس نے غزل پڑھنا شروع کی. محمد احمد ہر شعر پر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے. وہ اُسے قتیل ہی کی غزل سمجھے تھے. داد د ے د ے کر اُن کا بُرا حال تھا. بالآخر اُس نے مقطع پڑھا.

.
کرد مارا بہ یک نظارہ قتیل
ختم بر توست ا ے چہ رعنائی

.
اِس شعر کو بھی بے پناہ داد سے نوازا گیا. علی سکندر نے دو قدم پیچھے ہٹ کر بھائی کو ایک فرشی سلام کیا.
"یہ قتیل کی نہیں، اِس خاکسار کی ادنی کاوش تھی جس پر آپ اتنا خوش ہو رہے تھے."
اُس نے کہا اور بھاگ کھڑا ہوا.

.
یہ خبر چُھپنے والی نہیں تھی. اُن دنوں اُس کے والد بھی لکھنؤ آئے ہوئے تھے. اُس کی شرارت کی خبر والد کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی.
"ہم نے سُنا ہے، فارسی میں تم نے کوئی غزل کہی ہے؟" والد نے پوچھا
"کہی تو ہے." اُس نے سر جُھکا کر جواب دیا.
"ذرا ہم بھی تو سُنیں."
اُس نے جِھجکتے ہوئے وہ غزل والد کے گوش گزار کر دی. خوشی کی بات تو تھی ہی. تیرہ چودہ برس کی عمر اور فارسی میں غزل! والد نے شاباش دی.
"تم غزل کہہ سکتے ہو مگر ابھی نہیں. پہلے اپنی تعلیم مکمّل کر لو، اُس کے بعد شاعری کرنا." والد نے نصیحت کی. پھر اُس سے پوچھا، "تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ اپنی غزل قتیل کی کہہ کر کیوں سُنائی؟"
"بھائی صاحب کو بتانے کے لیے کہ قتیل جیسی غزل کہنا کوئی کمال نہیں ہے. وہ تو میں بھی کہہ سکتا ہوں اور وہ بھی ایسی کہ بھائی صاحب کو گمان بھی نہیں گزرا کہ یہ زبان قتیل کی نہیں." والد صاحب نے پھر خوشی کا اظہار کیا لیکن نصیحت یہی کی کہ وہ ابھی اِس خار زار میں قدم نہ رکھے.
اُنہوں نے نصیحت ضرور کی لیکن چَھلنی میں پانی سماتا کہاں ہے! وہ اشعار لکھتا رہا اور کاپیاں چُھپاتا رہا.
.
ایسے ہی ہم ذوق مل گئے تھے جن کے ساتھ بیٹھ کر بڑا شاعر بننے کی ترکیبیں سوچی جاتی تھیں. شاعروں کے تخلّص بھی ہوتے ہیں. کسی کا دل تخلّص تھا، اُس نے اپنے لیے جگر مُنتخب کیا. اِس عجیب و غریب تخلّص پر اُس کے دوست دیر تک ہنستے رہے لیکن پسند بھی سب کو آیا. والد کا تخلّص نظر تھا، وہ جگر ہو گیا. تخلّص کے انتخاب کے بعد یہ مرحلہ درپیش تھا کہ اُستاد کسے بنایا جائے؟ لکھنؤ میں کوڑیوں شاعر بکھر ے ہوئے تھے لیکن لکھنوی طرزِ ادا اُس کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی. تشبیہات کی رنگینیوں سے زیادہ سادگی کا قائل تھا.
.
سبھی اندازِ حُسن پیار ے ہیں
ہم مگر سادگی کے مار ے ہیں
.
اُس وقت ہندوستان بھر میں داغ کی دُھوم مچی ہوئی تھی.
شاعرِ مشرق علّامہ محمد اقبال تک داغ کے شاگرد تھے. صحتِ زبانِ سادگی اور شوخیِ ادا میں کوئی داغ کا ثانی نہیں تھا. مصیبت یہ تھی کہ داغ حیدر آباد دکن میں تھے اور جگر کی عمر ایسی نہیں تھی کہ اتنا طویل سفر کر کے اُن تک پہنچتا. وہ کئی دن تک اِس گُتھی کو سُلجھاتا رہا. کئی مرتبہ تو یہ سوچا کہ گھر سے بھاگ کر داغ تک پہنچ جائے. لیکن پھر ہمت نے پاؤں سمیٹ لیے، اب ایک ہی صورت تھی. اُس نے ایک پرچے پر غزل اُتاری اور ڈاک کے حوالے کر دی. اللہ ری شہرت! فصیح الملک نواب داغ دہلوی کا نام اور حیدر آباد لکھ دینا کافی ہوتا تھا.
.
چند دنوں کے انتظار کے بعد اُس کی غزل اِصلاح ہو کر اُس تک پہنچ گئی.

"لو بھئی، ہم تو داغ کے شاگرد ہو گئے." اُس نے دوستوں کی محفل میں اعلان کر دیا. یہ دیکھو داغ کے قلم سے اِصلاح ہوئی ہے.
دوست بھی اُس کے ہم عمر تھے. سراپا اشتیاق بن گئے. کبھی اُسے دیکھتے کبھی اِصلاح شدہ غزل کو. لفظ تھے کہ موتی. موتی بھی آب دار. دریائے تغزل سے سطح پر آئے ہوئے. داغ نے غزل واپس نہیں کی بلکہ اِصلاح کے قابل سمجھی. بس یہی بہت تھا. دوستوں نے اُس کی اہمیت کو تسلیم کر لیا.

.

شاعری کے شوقِ بے پناہ کا فوری اثر یہ ہوا کہ نویں جماعت میں دوسری مرتبہ فیل ہونے کے بعد پڑھائی چھوڑ بیٹھا.
اب اُس کے لیے لکھنؤ میں رہنا بے کار تھا. چچا بھی اُس کی آوارگی سے خوش نہیں تھے. اُن کے کانوں میں تو یہ خبریں بھی پہنچنے لگی تھیں کہ وہ نشہ بھی کرنے لگا ہے. اُس پر غضب یہ ہوا کہ والد کے انتقال کی خبر آ گئی. اُسے لکھنؤ کو خیر باد کہہ کر مراد آباد واپس آنا پڑا.

وہ لکھنؤ سے مراد آباد پہنچا تو بچپن کے دوستوں نے اُسے گھیر لیا. آوارہ مزاجی اُس کی طبیعت میں چُھپی بیٹھی تھی جو موقع ملتے ہی باہر کی طرف لپکی تھی. یہاں بھی اُسے ایسے دوست مل گئے جنہوں نے اُس کے پیروں میں پہئیے لگا دیے. گھڑی بھر کو گھر میں ٹِکتا ہی نہیں تھا. ابھی گھر میں ہے اور پلک جھپکتے ہی اُس کی خوشبو ندارد. والد کا انتقال ہو چکا تھا، کوئی اور بڑا سر پر تھا نہیں. یوں بھی یتیم بچے سے سب شفقت کا ہی برتاؤ کرتے ہیں. کسی نے غور ہی نہیں کیا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے.

.

یہاں ایک حکیم صاحب تھے جن کے پاس وہ کبھی کبھی جا کر بیٹھ جاتا تھا. حکیم صاحب نشہ کرنے کے عادی تھے. کبھی بھنگ پی لیتے تھے کبھی کچھ اور. حکیم صاحب کی صحبت میں وہ اُس کُوچے کی سیر کو بھی جا نکلا. غضب خدا کا! چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ نشہ کرنے لگا. ایک مرتبہ حکیم صاحب نے انگور کی بیٹی سے بھی اُس کا تعارف کروایا. اُس کے ہاتھ میں گلاس، گلاس میں شراب اور دل میں یہی عہد تھا کہ ہاتھ تھاما ہے تو چھوڑنا نہیں ہے. اِس شے نے اُس کی طبیعت کو اور زیادہ بے قرار کر دیا. شہر سے باہر چلا جاتا اور گھنٹوں گُھوم کر واپس چلا آتا.

.

اِس صحرا نوردی میں کچھ وقت شاعری کے لیے بھی تھا. یہ الگ بات کہ نشے کی طرح شاعری بھی ابھی اندر ہی اندر سفر کر رہی تھی. جب ہوش آیا تو داغ کا انتقال ہو چکا تھا. اُن کی اِصلاح شدہ ایک ہی غزل اُس کے کاغذات میں محفوظ تھی. لیکن اب کیا کِیا جائے! اُس کے سر پر پھر کسی کو اُستاد بنانے کی دُھن سوار ہوئی.

.

ایک روز وہ کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک غزل کی سج دھج نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا. بالکل اُستاد داغ کا مزہ تھا.

.

میری حسرت اور نکالی جائے گی

وعدہِ فردا پہ ٹالی جائے گی

.

شاعر کے نام پہ نظر ڈالی، رسا رام پوری. ار ے! یہ اپنے پڑوس کا رام پور. طاق میں چراغ جل رہا ہے اور گھر میں اندھیرا ہے.

داغ تو دور تھے لیکن رام پور تو قریب ہے. رسا رام پوری سے تو ملا جا سکتا ہے. اُس نے ایک دوست کو ساتھ لیا اور رام پور پہنچ گیا. چودہ پندرہ میل کا فاصلہ باتوں باتوں میں کٹ گیا.

.

اِس چھوٹے سے شہر میں رسا رام پوری کا پتہ ڈھونڈنا کون سا مشکل تھا. یہ مشکل اسٹیشن پر ہی حل ہو گئی.

کئی چوڑی پتلی گلیوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک بڑے سے پھاٹک کے سامنے کھڑا تھا. یہ تھا رسا رام پوری کا مکان. جان نہ پہچان، لیکن اُس کی بیتابی اُسے کھینچ لائی تھی. اُس نے ہمت کر کے درواز ے کی کنڈی زار زار کھڑکا دی.

"کون ہے بھائی؟" اندر سے ایک پاٹ دار آواز آئی. وہ خاموش رہا. نام کیا بتاتا کہ صاحبِ خانہ اُسے پہچانتے تو تھے نہیں.

ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ کُھلنے کی آواز آئی اور پھر اُس بڑ ے درواز ے کا ایک حصّہ کُھل گیا. دروازے پر ایک لڑکا کھڑا تھا جو کہ غالباً ملازم تھا.

"جی فرمائیے!"

"میرا نام علی سکندر ہے. مراد آباد سے حاضر ہوا ہوں. رسا رام پوری سے ملنا ہے."

"ٹھہرئیے میں پوچھ کر آتا ہوں. کیا نام بتایا آپ نے؟"

"وہ مجھے نام سے نہیں پہچانتے ہوں گے. اُن سے کہئیے کہ مراد آباد سے اُن کا ایک پرستار آیا ہے."

لڑکا سر جُھکا کر اندر چلا گیا. اور تھوڑی دیر میں واپس آ گیا.

"آئیے!"

وہ اپنے دوست کے ساتھ اندر چلا گیا. دروازہ ختم ہوتے ہی بائیں طرف کو مردانہ حصّہ تھا.کمر ے کی آرائش بالکل اِس طرز کی تھی جو اُس وقت شرفا کے گھروں کا قاعدہ تھا. چوکیوں کا فرش لگا ہوا تھا. ایک طرف مونڈھے مُڑ ے ہوئے تھے، ایک طرف دو کرسیاں تھیں. دیواروں پر کچھ تصویریں بھی آویزاں تھیں جنہیں ظاہر ہے وہ نہیں جانتا تھا.

وہ لڑکا پھر آیا. اُس کے ہاتھ میں شربت کے دو گلاس تھے. ایک گلاس جگر نے لے لیا، ایک اُس کے دوست نے. تھوڑی دیر میں خاصدان میں پان بھی آ گئے.

"سُنو! رسا صاحب کیا کر رہے ہیں؟" جگر نے اُس لڑکے سے پوچھا.

"بس آ رہے ہیں." اُس لڑکے نے کہا اور کمر ے ہی میں ایک طرف کھڑا ہو گیا.

عطر کی تیز مہک نے بتا دیا کوئی آ رہا ہے. رسا رام پوری کے سوا کون ہو سکتا تھا؟ ململ کا کرتہ، چھوٹی موری کا پاجامہ، سر پر رام پوری طرز کی کپڑ ے والی ٹوپی. چھریر ے بدن کا ایک آدمی کمر ے میں داخل ہوا. دونوں اپنی جگہ سے کھڑ ے ہو گئے.

"اچھا تو آپ حضرات تشریف لائے ہیں مراد آباد سے. رام پور کیونکر آنا ہوا اور ہم سے ملنے کا اشتیاق کیونکر ہوا؟"

"جی وہ آپ کی ایک غزل پڑھی تھی ایک رسالے میں. سوچا آپ سے ملاقات بھی کی جائے."

"سُخن فہم ہو؟"
"سُخن ساز بھی ہوں!" جگر نے برجستہ کہا.
"بہت خوب!" اُنہوں نے کہا اور پھر ملازم سے مُخاطب ہوئے. "حُقّہ تازہ کر لاؤ."
"تخلّص کیا فرماتے ہیں آپ؟"
"جگر."
"بہت نادر تخلّص ہے، اِس کی حفاظت کرنا. میرا مطلب ہے شاعری کرتے رہئیے گا."
"بشرطیکہ آپ جیسا کامل اُستاد مل جائے."
"ایں! ابھی تک اُستاد کے بغیر گُھوم رہے ہو."
"طبعِ رسا کی رہنمائی میسّر ہے." رسا کی رعایت سے جگر نے کہا. "ویسے ایک غزل پر داغ مرحُوم سے اِصلاح لی تھی. دوسری غزل روانہ کرنے کی نوبت نہیں آئی کہ اُن کا انتقال ہو گیا. اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں. داغ مرحُوم کے بعد مجھے آپ ہی کا رنگ پسند آیا."

.

حُقّہ آ گیا تھا. رسا ہلکے ہلکے کش لگاتے رہے اور کچھ سوچتے جاتے تھے. جگر سانس روکے جواب کا منتظر تھا.
"میاں داغ مرحُوم کا نام لے کر تم نے ہمیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا. کیسی پُر لطف بات یاد آ گئی. لو تم بھی سُنو. داغ کو جب پہلے پہل رام پور میں ملازمت ملی تو اُس وقت میری نوجوانی تھی. وہ سرکاری اصطبل میں مہتمم مُقرر ہوئے تھے. اُن کے سیاہ رنگ کی مُناسبت سے میں نے ایک شعر موزوں کیا اور شرارت دیکھئیے کہ اصطبل کی دیوار پر لکھ بھی دیا.

.

شہرِ دہلی سے آیا ایک مشکی
اور آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

.

اللہ رے اعلی ظرفی! داغ نے چراغ پا ہونے کی بجائے تبسّم کیا اور اعلان کیا کہ جس نے یہ شعر کہا ہے وہ مجھ سے ملے. شاید انعام دینے کا بھی وعدہ کیا تھا. لیکن میری ہمت نہیں ہوئی کہ میں اپنی اِس شرارت کا اعتراف کرتا."
اِس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں. جگر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا کہ مطلب کی بات دور نکل گئی.
"کیا میں یہ باور کر لوں کہ آپ نے مجھے شرفِ تلمذ عطا کر دیا ہے؟" جگر نے موقع دیکھ کر کہا.
"میاں ایسے نہیں، کچھ سُناؤ تو، ہم بھی دیکھیں کتنے پانی میں ہو."
جگر تو تیار ہی ہو کر آیا تھا. اُس نے ایک مرتبہ پھر اجازت لی اور غزل پڑھنی شروع کی.

تصوّر جب کسی دستِ نگاریں کا رہا دل میں
تو شمعِ طُور ہو کر رنگ لائی کیا دل میں

نہیں سوزِ نہانی سے جو میر ے آبلہ دل میں
تو مِثلِ قلقلِ مِینا چھلکتا ہے یہ کیا دل میں

وہ حسرت ہوں کہ حسرت کو ہے حسرت میری حسرت پر
وہ مُضطر ہوں کہ گویا ہے گزر سیماب کا دل میں

وہ ہوں دیوانۂ بے کس کہ جب گلشن میں جا نکلا
تو ایک شورِ قیامت ہو گیا برپا عنا دل میں

وہ بے کس ہوں کہ میری بے کسی پر بس کہ ا ے قاتل
کیا کرتی ہے حسرت خندۂ دنداں نما دل میں

وہ کہتے ہیں کہ اُس نے جان د ے دی سنکھیا کر
خدا جانے جگر کم بخت کے کیا آ گیا دل میں

غزل میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن یہ ایسا آئینہ ضرور تھی جس میں آئندہ کی ترقی صاف نظر آتی تھی. ظاہر ہوتا تھا کہ شاعر کا مُستقبل تابناک ہے. رسا جیسے اُستاد اگر قسمت والوں کو ملتے ہیں تو جگر جیسا شاگرد بھی کسی قسمت والے کو ملتا ہے. اُستاد آگے بڑھے اور شاگرد کی پیشانی پر بوسۂ شفقت ثبت کر دیا.
اب اُس کی آوارگی کے ساتھ ساتھ اُس کی شاعری بھی محوِ پرواز تھی.

ایک دن کسی دُھن میں وہ گھر سے باہر بیٹھا تھا کہ ایک ہندو لڑکی سر پر گھڑا رکھے اُس کے سامنے سے گزری۔ چلتے چلتے اُس لڑکی نے ایک نظر اُس کو دیکھا۔ خدا جانے اُس لڑکی کی آنکھوں میں کیا تھا کہ وہ پتھر بن کر رہ گیا۔ وہ کدھر سے آئی تھی، کہاں گئی، اُسے کچھ خبر نہیں تھی۔ عجیب عالمِ بے خودی تھا اور اگر ہوش تھا تو یہ کہ

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

وہی قیامت ہے قد بالا، وہی ہے صورت، وہی سراپا
لبوں کو جُنبش، نگہ کو لرزش، کھڑ ے ہیں اور مُسکرا رہے ہیں

وہی لطافت، وہی نزاکت، وہی تبسّم، وہی ترنّم
میں نقشِ حرماں بنا ہوا ہوں، وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں

خرامِ رنگیں، نظامِ رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پر، روش روش پر، نئے نئے گُل کھلا رہے ہیں

شباب رنگیں، جمال رنگیں، وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں، تمام رنگیں بنا رہے ہیں

تمام رعنائیوں کے مظہر، تمام رنگینیوں کے منظر
سنبھل سنبھل کر، سمٹ سمٹ کر، سب ایک مرکز پر آ رہے ہیں

بہار رنگ و شباب ہی کیا! ستارہ و ماہتاب ہی کیا!
تمام ہستی جُھکی ہوئی ہے، جدھر وہ نظریں جُھکا رہے ہیں

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے، نظر سے مستی اُبل رہی ہے
چھلک رہی ہے، اُچھل رہی ہے، پئے ہوئے ہیں، پلا رہے ہیں

خود اپنے نشے میں جُھومتے ہیں، وہ اپنا منہ آپ چُومتے ہیں
خرامِ مستی بنے ہوئے ہیں، ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں

وہ رُوئے رنگیں، وہ موجۂ نسیم کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیِ حُسن کا ہے عالم، عرق عرق میں نہا رہے ہیں

یہ مست بُلبل بہک رہی ہے، قریبِ عارض چہک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے، وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں

یہ موجِ دریا، یہ ریگ صحرا، یہ غنچہ و گل، یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مُسکرا دیے ہیں، یہ سب کے سب مُسکرا رہے ہیں

فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے، کہ موجِ دریا ٹھہر گئی ہے
سکوتِ نغمہ بنا ہوا ہے، وہ جیسے کچھ گنگنا رہے ہیں

ذرا جو دم بھر کو آنکھ جھپکی، یہ دیکھتا ہوں نئی تجلی
طلسمِ صورت مٹا رہے ہیں، جمالِ معنی بنا رہے ہیں

اب آگے جو کچھ بھی ہو مقدر، رہے گا لیکن یہ نقش دل پر
ہم اُن کا دامن پکڑ رہے ہیں، وہ اپنا دامن چُھڑا رہے ہیں

خوشی سے لبریز شش جہت ہے، زبانِ پُرسوز تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے جگر کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں
-

تصورات کی دنیا تو کسی کے دم سے آباد تھی۔ ایک لمحے کو اُس کی تصویر نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی، وہ جب آنکھیں کھولتا، لگتا تھا، وہ کھڑی ہے، مُسکرا رہی ہے۔

کدھر ہے تیرا خیال اے دل! یہ وہم کیا کیا سما رہے ہیں!!
نظر اُٹھا کے تو دیکھ ظالم! کھڑے وہ کیا مُسکرا رہے ہیں

وہ گھبرا کے پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ پرچھائیوں سے لڑنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ اُس کے تصور سے ڈرنے لگا، یہ کیسی صورت تھی جو ہٹ کر بھی میرے سامنے سے ہٹتی ہی نہیں۔

بے تاب ہے، بے خواب ہے، معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں

بے نام سی اک یاد ہے کیا جانئے کس کی
بے وجہ تب و تاب ہے، معلوم نہیں کیوں

خلوت میں بھی، جلوت میں بھی گھیرے ہوئے دل کو
اک شعلہِ بے تاب ہے، معلوم نہیں کیوں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیّر
میرے لیے بے تاب ہے، معلوم نہیں کیوں

اِس بے خبری کو خبر میں بدلنے کے لیے اُس نے ساغر میں اُنڈیلنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ بوتل سے منہ لگایا اور آگ سینے میں اُتار لی۔
میرے یار! اِس آگ میں برف، سوڈا یا پانی تو ملا لے!
نہیں۔ کچھ نہیں۔ کچھ ملا لیا جائے تو مجھے شرک کی بُو آتی ہے۔
حال یہ ہو گیا کہ جب ہوش میں آتا تو غارت گرِ ہوش سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی۔ وہ گھبرا کر پھر بوتل اُٹھا لیتا۔ بس اِتنی سی دیر وہ اُسے بُھولے رہتا۔ وہ ذرا دیر کے لیے ہوش میں آتا تو پھر یہ عالم ہو جاتا

یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

وہ اُسے بُھلانے کے لیے نشے میں ڈوبا رہا۔ وہ کون تھی؟ شاید اُس کے کسی سوئے ہوئے جذبے کو جگانے آئی تھی۔ وہ جاگ گیا تو وہ پھر اُسے کبھی نہیں ملی۔

وہ گھر کی طرف سے غافل ہو گیا تھا. دوسرے لفظوں میں بالکل ہی بگڑ گیا تھا. اُس کے سرپرست اُس کے چچا ہی تھے. وہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے آئے تو جگر کی والدہ نے اُن سے اُس کی آوارگی کا ذکر کیا.
"علی سکندر تو میرے ہاتھ سے گیا. سچ ہے، باپ سر پر نہ ہو تو بچے اِسی طرح بگڑ جاتے ہیں."
اُس کی والدہ نے کہا.

"سچ ہے، اِس میں کوتاہی میری بھی ہے۔ مجھے چاہئیے تھا کہ اُس کی مصروفیت کا کوئی سامان پیدا کر دیتا۔ پڑھنا تو اُس نے چھوڑ ہی دیا۔ اگر کہیں نوکری ہو جائے تو آہستہ آہستہ سنبھل جائے گا۔"
یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور جلد ہی اُس کے لیے نوکری کا بندوبست کر دیا۔
نجیب آباد میونسپلٹی میں محافظِ دفتر کی آسامی خالی تھی، جگر کا وہاں تقرر ہو گیا۔
نوکری کے بکھیڑ ے اُس کے بس کے نہیں تھے۔ لیکن یہ سوچ کر تیار ہو گیا کہ مراد آباد سے دور رہے گا تو اُس آفتِ جاں کو بُھلا سکے گا جو نہ ملتی ہے نہ بُھلائی جاتی ہے۔
وہ اپنی یادیں مراد آباد کی کسی گلی میں دفن کر کے نجیب آباد پہنچ گیا۔
نجیب الدولہ کی یادگار نجیب آباد میں وہ تنہا تھا۔ اُس کے چچا کو اِس کا احساس تھا۔ اُنہوں نے فوراً اُسے خط لکھا کہ وہاں ایک تحصیل دار فلاں نام کے ہیں۔ اُن سے جا کر ملو۔ خالی اوقات میں اُن سے ملتے رہنا۔ تمہارا وقت کٹ جائے گا۔ اُن کے ذریعے دوسر ے لوگوں سے بھی ملاقات ہو گی۔
وہ پریشان تو تھا ہی۔ خط ملتے ہی تحصیل دار کے پاس پہنچ گیا۔ جگر کے چچا نے تحصیل دار کو بھی خط لکھ دیا تھا۔ لہٰذا دیکھتے ہی پہچان گئے۔
"علی سکندر ہو؟"
"جی!"
"آج سے تم مجھے تحصیل دار نہیں، اپنا چچا سمجھنا۔ کوئی مسئلہ ہو، بتانے میں تکلّف مت کرنا۔"
"جی بہت بہتر۔"
"تمہاری چچی سے ملواتا ہوں۔ اُن سے بھی مل لو۔ میں گھر میں نہ بھی ہوں تو بے کھٹک چلے آنا۔ بس یہ سمجھو کہ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ کوئی پردہ، کوئی تکلّف نہیں۔"
اُنہوں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ تحصیل دار بُوڑھے آدمی تھے لیکن اُن کی بیوی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ایک نوجوان عورت اُس کے سامنے کھڑی تھی اور تحصیل دار صاحب کہہ رہے تھے یہ تمہاری چچی ہیں۔ وہ عورت اتنی خوبصورت تھی کہ جگر کی حُسن پرستی پلک جھپکنا بُھول گئی۔
"بھئی یہ ہمار ے دوست کا بھتیجا ہے۔ یہاں نوکری کے سلسلہ میں آیا ہے۔ اِس کی دیکھ بھال ہمارا فرض ہے۔"
"کیوں نہیں۔ یہ تو ہمار ے بچوں کی طرح ہے۔"
"میاں تم اپنا سامان یہیں لے آؤ۔ چھت پر کمرہ موجود ہے، ٹھاٹ سے رہو۔"
تحصیل دار صاحب نے کہا اور اُن کی بیوی نے تائید کی۔
"آپ کو زحمت ہو گی۔"
اماں زحمت کیسی؟"
جگر اُسی دن اُن کے گھر اُٹھ آیا۔
تحصیل دار کی یہ بیوی پہلے طوائف تھیں۔ تحصیل دار نے انہیں گھر میں ڈال لیا تھا۔
بلا کی حسین، حد درجہ شوخ۔ چند روز کی قربت بڑھی اور بے تکلّفی ہوئی تو جگر کا دل اُن کی زلفوں میں اٹک گیا۔ توجہ اِس طرف ہوئی تو وہ مراد آباد کا رنگین حادثہ بُھول گیا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ اُس نے اِس موقع کو غنیمت جانا اور بہانے بہانے سے زیادہ سے زیادہ وقت تحصیل دار کی بیوی کے ساتھ گزارنے لگا۔ تحصیل دار کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا کہ موصوف شاعر بھی ہیں تو اُس کی دلچسپی بھی بڑھی۔ وہ سُخن فہم بھی تھیں اور ترنّم کی باریکیوں سے واقف بھی۔ اُنہوں

نے ضد کر کے جگر کا کلام سُنا تو اُس کے عاشقانہ اشعار اور دل آویز ترنّم پر نثار ہو گئیں. اب یہ عالم ہوا کہ جگر جب کوئی نئی غزل کہتا، سب سے پہلے اُنہیں سُناتا. اُن کا بھی یہ عالم ہوا کہ پور ے گھر میں اُس کے شعر گنگناتی پھرتی تھیں.

.

آئینہ رُو برو ہے، کچھ گنگنا رہے ہیں
زلفیں سنور چکی ہیں، قشقہ لگا رہے ہیں

کافر جمال والے کافر بنا رہے ہیں
ایمان لانے والے ایمان لا رہے ہیں

ساون کی رین اندھیری راتوں کا عالم
بُھولے ہوئے افسانے سب یاد آ رہے ہیں

.

اُس کی شاعری ابھی اُس کی ذات تک ہی محدود تھی. لوگ اُس کے نام سے آشنا نہیں ہوئے تھے. وہ غزلیں لکھتا اور ڈاک کے ذریعہ رسا رام پوری کو بھیج دیتا.
جگر کی یہ حالت تھی کہ اپنی میزبان پر سو جان سے فدا تھا. وہ جس کی خاطر ویرانۂ عشق میں سرگرداں ہے، خود اُس کے دل میں کیا ہے؟ یہ عقدہ نہیں کھلتا تھا. خود اُس کا یہ عالم تھا. اور ساری باتیں کرتا تھا، اظہارِ عشق کی ہمت نہیں ہوئی تھی.

.

ایک دن اُس نے اپنا حالِ دل ایک کاغذ پر تحریر کیا اور تحصیل دار کی بیوی کو د ے دیا. وہ سمجھیں کوئی تازہ غزل ہے. مُسکرا کر پرچہ وصول کر لیا. پھر کسی کام میں مصروف ہو گئیں. ذرا فرصت ملی تو اُنہوں نے پرچہ کھولا. پڑھتے ہی اُن کی تیوریوں میں بل پڑ گئے. اظہارِ عشق کی تمام منزلیں طے ہو چکی تھیں.

وہ خاموشی سے اُٹھیں اور تحصیل دار کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں. تحصیل دار نے نگاہ اُٹھائی اور اُنہوں نے پرچہ آگے بڑھا دیا.
"یہ کیا ہے؟"
"آپ کے دوست کے بھتیجے کے کرتوت."
"کیا مطلب؟"
"پڑھ کر تو دیکھئیے."
تحصیل دار نے پڑھنا شروع کیا. غصّے اور صدمے سے اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے.
"کہاں ہیں صاحب زاد ے؟"
"اُس سے کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں. یہ بات اُن کے بڑوں کے علم میں آنی چاہئیے. اُنہیں بھی تو معلوم ہو کہ ہمار ے احسانات کا بدلہ ہمیں کس صورت میں واپس ملا ہے."
"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو. میں ابھی اُس کے چچا کو خط لکھتا ہوں."
تحصیل دار نے خط لکھ دیا. جگر کا خط بھی اُس خط کے ساتھ روانہ کر دیا.
اُن کا خط آیا کہ علی سکندر کو کہیں جانے مت دینا. میں نجیب آباد پہنچتا ہوں اور پہنچ بھی گئے.

جگر نے جو یوں اچانک اُنہیں وہاں دیکھا تو ساری بات سمجھ میں آ گئی. اب بھاگنے کے لیے رستہ نہیں تھا. چچا تو تحصیل دار کے پاس بیٹھ کر اصلیت جاننے میں مصروف ہو گئے. جگر اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچنے لگا. پھر ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی. اُس کے پاس بہت ساری بھنگ رکھی ہوئی تھی. اُس نے اتنی ساری بھنگ ایک ساتھ کھا لی کہ بے ہوش ہو گیا.

اُس کے چچا اور تحصیل دار صاحب کمر ے میں آئے تو وہ بے سُدھ پڑا ہوا تھا.

صاف ظاہر تھا کہ اُس نے خودکشی کی کوشش کی ہے. دونوں کا غصّہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا.

"بچے سے ایک حرکت سرزد ہو گئی تھی. سمجھا بُجھا کر بات رفع دفع ہو جاتی. مگر اِس نے تو یہ بڑی عجیب نادانی کی." تحصیل دار نے کہا.

"کسی کو بُلوائیے صاحب! اِسے اسپتال لے کر جانا ہو گا." تحصیل دار نے اپنے نوکر کو آواز دی، کچھ خود ہاتھ لگایا اور اُسے اُٹھا کر اسپتال لے گئے.

.

اُسے ہوش آ گیا تھا مگر نیم غنودگی کے عالم میں تھا. ذرا سوچنے کے قابل ہوا تو اُسے یاد آیا چچا یہاں کیوں آئے ہیں. ابھی تھوڑی ہی دیر میں اُسے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ ے گا. اُسے لعنت اور ملامت کی جائے گی. وہ چچا کا سامنا کس طرح کر ے گا. اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ یہاں سے فرار ہو جائے. وہ نجیب آباد سے نکل گیا. پہلے سوچا کہ مراد آباد چلا جائے لیکن سوچا کہ چچا تو وہاں بھی آ سکتے ہیں. بلکہ پہلے وہاں آئیں گے پھر کہیں اور جائیں گے. مجھے تو ایسی جگہ جانا چاہئیے جہاں مجھے کوئی ڈھونڈ نہ سکے. جہاں کسی کا خیال بھی نہ پہنچے.

وہ منزل کا تعیّن کیے بغیر روانہ ہوا تھا اور کسی ارادے کے بغیر آگرہ پہنچ گیا. یہاں کیوں آ گیا؟ کیا کرے گا؟ کب تک ٹھہرے گا؟ اُس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا.

.

وہ نجیب آباد سے بے سروسامانی کی حالت میں فرار ہوا تھا. چند کپڑوں اور کچھ روپوں کے علاوہ کچھ بھی اُس کے پاس نہیں تھا. ہاں وہ کاپی! اُس کے ساتھ تھی. جس پر اُس نے اب تک کی غزلیں لکھی ہوئی تھیں. اُس نئے شہر میں کوئی اُسے جانتا بھی نہیں تھا. وہ شاعر ہے. یہ تو اُسے ابھی خود بھی معلوم نہیں تھا. فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی کے کلام رسالوں میں پڑھتا رہتا تھا. اُن سے مرعوب بھی تھا. اُس نے تو یہ بھی سُن رکھا تھا کہ مولانا حالی کی سخت ترین تنقید کے بعد اُردو غزل پر جو عام مایوسی طاری ہوئی تھی، اِن شعرا کی غزلوں نے اِس مایوسی کو ختم کر کے غزل کا اعتبار قائم کیا ہے. انگریزی ادب کے اثر سے نظموں کو فروغ مل رہا ہے لیکن یہ دونوں شاعر جاندار غزلیں لکھ کر نظم گوئی کا مقابلہ کر رہے ہیں. اِن غزل گو شاعروں نے غزل کے مضامین کو حقیقت سے قریب تر کیا ہے. اِن کی غزلیں عشق کا ایک نیا معیار پیش کر رہی ہیں. وہ سوچتا تھا، وہ بھی اِس قافلے میں شریک ہوگا. لیکن ابھی تو معاش کی سختیاں ہی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں. وہ آگرہ کی سڑکوں پر خلقِ خدا سے بے نیاز گُھومتا پھر رہا تھا. پاس سے گزرنے والے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے کہ اِس عجیب سے حُلیے کے لڑکے کے عزائم کیا ہیں اور یہ کون ہے؟

.

وہ سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا اور اُس لمحے کی تلاش میں تھا جب اُسے معاش کی کوئی سبیل نظر آ جائے. سستی سرائے کی بوسیدہ کوٹھڑی میں جب وہ اپنی حالت پر غور کرتا تھا تو ایک آہ سی نکل جاتی تھی.

.
جس نے بنا دیا مجھے وحشی و خستہ حال سا
ہائے وہ شکل چاند سی، ہائے وہ قد نہال سا

.
وطن سے دور تھا. بے سہارا تھا لیکن ابھی حوصلہ نہیں ہارا تھا. اُس کے عزائم اب بھی بُلند تھے.

.
گم شدگانِ عشق کی شان بھی کیا عجیب ہے
آنکھوں میں اک سُرور سا، چہر ے پہ اک جلال سا

.
اُس نے سُرور کی آخری بُوند اپنے اندر اُتاری اور صبح کے استقبال کی تیاری کے لیے چراغ بُجھا دیا.

.
سرائے میں صبح ہوئی تو وہ بھی بیدار ہو گیا. اُسے ہنسی آ گئی. میں تو یوں اُٹھ بیٹھا ہوں جیسے نوکری پر جانا ہے.
سڑکیں ناپنے کے لیے وہ روز کی طرح پھر ایک سڑک پر آ گیا. دکانوں اور دفتروں پر لگے ہوئے سائن بورڈ پڑھتا چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ اُس کے قدم رُک گئے. "بی این بیچل" یہ چشموں کی ایک فرم تھی. اُس نے یہ نام سُنا ہوا تھا. دل نے کہا گوہرِ مقصود یہیں ملے گا. وہ اندر چلا گیا.
"مجھے کسی ایسے آدمی سے ملنا ہے جو مجھے نوکری دے سکے." اُس نے وہاں بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے کہا.
"اُس کمرے میں مینیجر صاحب بیٹھے ہیں. اُن سے مل لو." اُس آدمی نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا.
اُس نے چِک اُٹھائی اور اجازت لیے بغیر ہی اندر چلا گیا. اندر ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا تھا. جگر نے اُس سے اِس طرح ہاتھ ملایا جیسے بہت پُرانا شناسا ہو اور اُس کے سامنے کُرسی پر بیٹھ گیا.
"میرا نام جگر ہے. میں نوکری کی تلاش میں ہوں. آپ مجھے نوکری د ے دیں."
مینیجر نے ایسا نام پہلی مرتبہ سُنا تھا. نوکری کا مطالبہ بھی اِس انداز میں کسی نے نہیں کیا ہوگا. وہ بہت دیر تک اُس بے تکلّف لڑکے کو دیکھتا رہا.
"کیا کام کر سکتے ہیں آپ؟"
"کوئی بھی کام ہو."
ہمیں ایجنٹ حضرات کی ضرورت ہوتی ہے. اگر آپ یہ کر سکتے ہیں."
"میں تیار ہوں."
"اِس کے لیے آپ کو ضمانت کا انتظام کرنا ہوگا."
"میں تو اِس شہر میں کسی کو نہیں جانتا."
"پھر تو بہت مشکل ہے."
"میں شاعر ہوں. میرا کلام بطورِ ضمانت رکھ لیجئے. یہ میر ے لیے بڑی سے بڑی رقم سے زیادہ ہے."

اتفاق سے وہ شخص شاعروں کا قدردان تھا. یہ دیکھ کر کہ ایک شاعر اُس کے پاس آیا ہے، وہ پگھل گیا. اُس نے جگر کو کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے نوکری د ے دی.
کمپنی نے اُسے ایک بکس دیا. جس میں چشمے رکھے ہوئے تھے. اُسے یہ چشمے فروخت کرنے تھے اور دکان داروں سے آرڈر لے کر سپلائی کرنے تھے.
صحرا گرد کو نوکری بھی ملی تو ایسی کہ دکان دکان گھومتا رہے اور مُختلف شہروں کے چکر لگاتا رہے.
چشموں کی فروخت کے لیے اُسے مُختلف شہروں میں جانا پڑتا تھا. لیکن لوٹ کر آتا تو آگرہ ہی اُس کا مُستقل ٹھکانہ ہوتا تھا.
اِس شہر نوردی سے اُسے یہ فائدہ پہنچ رہا تھا کہ جس شہر میں جاتا، وہاں کچھ شاعروں سے اُس کی ملاقات ہو ہی جاتی تھی. وہ نہایت خاموشی سے اپنا نام اور غزلیں مُختلف شہروں میں پہنچاتا رہا. اُس وقت جو معتبر رسائل تھے، اُن میں بھی اُس کی غزلیں شائع ہونے لگیں. اُس نے ابھی کوئی مشاعرہ نہیں پڑھا تھا. لوگ اُس کا نام رسالوں میں پڑھتے تھے اور ایک ایک سے پوچھتے تھے کہ یہ جگر کون ہے؟

چلتے چلتے جگر کے جُوتے گِھس گئے تو اُس نے سوچا ایک جُوتا ہی بنوا لیا جائے۔ سرائے کے قریب ہی ایک جُوتے کی دکان تھی۔ وہ اُس دکان پر پہنچا اور پاؤں کا ناپ دے آیا۔ دکان کا مالک اُسے دلچسپ معلوم ہوا۔ وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھا۔
تھوڑی دیر میں دونوں خوب گھل مل گئے۔ یہ شخص بجنور کا رہنے والا تھا۔ اُس کا خاندان تجارت پیشہ تھا۔ کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن اُن دنوں معاشی بدحالی کا شکار تھا۔ اس چھوٹی سی دکان پر گزارہ تھا۔
اب یہ دکان اُس کا مستقل ٹھکانہ بن گئی۔ وہ شہر کا چکر لگا کر لوٹتا یا کسی شہر کی یاترا کے بعد واپس آتا تو اسی دکان پر بسرام کرتا۔
دوستی اتنی بڑھی کہ جگر اُس کے گھر بھی جانے لگا۔ کچھ دن بعد گھر کی عورتوں سے اُس کا پردہ رسمی سا رہ گیا۔ کچھ دن اُس کی مترنم غزلیں پرد ے کے پیچھے سُنی جاتی رہیں پھر سب سامنے آ گئے۔ اُن میں وحیدن بھی تھی۔ وحیدن کو اُس کے شوہر نے چھوڑ دیا تھا اور وہ باپ کے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔
وحیدن کو حسین کہا جا سکتا تھا۔ اُس کے حسین چہر ے، اُداس ہنسی اور نیچی نگاہوں نے جگر کو ایک اور ٹھوکر کھانے پر مجبور کر دیا۔
.
کچھ بات بن پڑی نہ دلِ داد خواہ سے
کیا جانے کیا وہ کہ گئی نیچی نگاہ سے

کوئی نہ بچ سکا تری قاتل نگاہ سے
ذر ے بھی صدقے ہو گئے اُٹھ اُٹھ کے راہ سے

یہ جانتا ہوں جانتے ہو میرا حالِ دل
یہ دیکھتا ہوں دیکھتے ہو کس نگاہ سے

.

ایک دن اُس نے یہ اشعار سُنائے تو وحیدن کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان اشعار کا مخاطب کون ہے۔ وہ بہت دن سے جگر کی آنکھوں کو پڑھ رہی تھی۔ اور اب اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں وہ بسی ہوئی ہے۔ جگر کی صورت تو واجبی تھی لیکن اُس کی شاعری، سحر انگیز ترنّم، پُر خلوص برتاؤ. وحیدن اُس کی اسیر ہو گئی. جگر کی آوارگی کو ایک اور ٹھکانہ مل گیا. ملاقاتوں کے سائے گھنیر ے ہونے لگے. سو سو پھیر ے ہونے لگے. جگر کا نیاز، ناز میں بدل گیا. اِس خیال نے کہ اِس پر کوئی مرتا ہے، اُس کا نشہ دو آتشہ کر دیا.

.

اُف وہ رُوئے تابناک و چشمِ تر میر ے لیے
ہائے وہ زلفِ پریشاں تا کمر میر ے لیے

ہر نفَس میں ایک دنیائے محبّت نو بہ نو
ہر نظر میں اک پیامِ تازہ تر میر ے لیے

وہ رُخِ رنگیں پہ انوارِ محبّت زرد زرد
وہ لبِ نازک پہ طوفانِ دِگر میر ے لیے

سر سے پا تک آہ وہ اک پیکرِ حُسنِ حزیں
چار جانب دیدہِ حسرت نگر میر ے لیے

سرد سرد آہوں میں تاثیرِ محبّت گرم گرم
خشک خشک آنکھوں میں جوشِ اشکِ تر میر ے لیے

سامنے آتے ہی آتے وہ تنفّس تیز تر
سینہِ شفّاف وہ زیر و زبر میر ے لیے

اُف وہ کہنا اُس کا پھر بانہوں میں بانہیں ڈال کر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میر ے لیے

.

سرائے کے سیلے فرش پر وہ رات بھر لفظوں کے موتی پروتا رہا. صبح ہوئی تو وہ طے کر چکا تھا کہ وحیدن کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لے گا.

اُس کے خیال کو زبان وحیدن نے دے دی. اُس نے وحیدن سے ذکر کیا اور وحیدن نے اپنے گھر والوں کو آمادہ کر لیا.

جگر نے کموٹولے میں کرائے پر مکان لیا اور وحیدن کو بیاہ کر لے آیا.

.

جگر نے شادی تو کر لی تھی لیکن اُسے اپنی آوارگیوں پر قابو نہیں تھا. کچھ تو اُس کا کام ایسا تھا کہ کئی کئی دن گھر سے غائب رہنا پڑتا تھا، کچھ وہ اپنی بے قراری سے مجبور تھا.

شراب کی لت ایسی پڑ گئی تھی کہ جو کماتا، بوتل میں ڈوب جاتا. وحیدن کو شادی کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شراب پیتا ہے. لیکن وہ ایسی صابر و شاکر عورت تھی کہ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائی. وہ کئی کئی دن گھر نہیں آتا اور آتا تو خالی ہاتھوں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ. گھر میں کیا ہو رہا ہے، اِس سے اُسے کوئی سروکار نہیں تھا. وحیدن اُس کی ہر خطا معاف کر رہی تھی. صرف اِس لیے کہ وہ اُس سے محبّت کرتا تھا.

مراد آباد میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جگر کہاں ہے. چچا کا انتقال ہو چکا تھا. بوڑھی ماں جگر کی خیریت کے لیے پریشان تھی لیکن کوئی نہیں بتاتا تھا کہ وہ کہاں ہے.

بالآخر ایک دن اُس کے بھائی علی ظفر کو معلوم ہوا کہ وہ آگرہ میں ہے. علی ظفر نے والدہ کو ساتھ لیا اور آگرہ آ گئے. کسی نہ کسی طرح وہ گھر تک بھی پہنچ گئے. جگر اُس وقت کہیں سے آ کر بیٹھا تھا. بھائی کو دیکھ کر جگر نے آنکھیں جُھکا لیں. شرمندگی ابھی تک تھی. والدہ کی آنکھوں سے کب کے رُکے ہوئے آنسو بہہ رہے تھے.

"میں آپ سے شرمندہ ہوں. آپ سے اجازت لیے بغیر میں نے شادی کر لی." اُس نے والدہ سے کہا.

"مجھے تو یہ خوشی ہے کہ تُو آباد ہوا ہے، برباد نہیں ہوا. تُو مجھ سے اجازت لیتا بھی تو میں انکار تھوڑی کرتی؟ اچھا ہوا تُو نے شادی کر لی."

اُنہوں نے وحیدن کو سینے سے لگایا. وحیدن کو یوں لگا جیسے اُس کی شادی آج ہوئی ہے.

ماں نے اصرار کر کے اُسے مراد آباد چلنے پر راضی کر لیا. وہ نوکری چھوڑ چھاڑ کر ماں اور بھائی کے ساتھ مراد آباد آ گیا. وحیدن بھی گویا پہلی مرتبہ میکے سے سسرال آئی. دیوانے کو کچھ دن کے لیے قرار آ گیا. بہت دن بعد مراد آباد آیا تھا، بہت دنوں تک در و دیوار کو تکتا رہا.

.

یاد ہیں اب تک جگر وہ بے قراری کے مز ے
دردِ پیہم کی لگاوٹ، زخم کاری کے مز ے

وہ جبینِ شوق اپنی، وہ کسی کے پائے ناز
سجدہ ریزی کی لطافت، اشکباری کے مز ے

حُسن کی سرشاریاں، خوابِ جوانی کی بہار
عشق کی بے تابیاں، شبِ زندہ داری کے مز ے

.

وحیدن کا ایک رشتہ دار عاقل مراد آباد میں رہتا تھا اور چشموں کا کاروبار کرتا تھا. جگر کو بھی اِس کام کا کچھ تجربہ ہو گیا تھا. اُسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا، عاقل کے ساتھ مل کر چشموں کی ایجنٹی شروع کر دی.

.

قمر مراد آبادی نے ایک مشاعرہ کروایا. سب کو معلوم تھا کہ جگر بھی شعر کہتا ہے. مشاعرہ مراد آباد ہی میں تھا لہٰذا جگر کو بھی بُلایا گیا. اُس وقت تک بہ حیثیتِ شاعر اُسے کم ہی لوگ جانتے تھے.

اُسے ابھی مشاعروں سے ملنے والی شہرت کا اندازہ نہیں تھا. اِس لیے اُس نے اُس مشاعر ے میں شرکت کا کوئی اہتمام نہیں کیا تھا. بلکہ وہ تو بُھول ہی گیا تھا کہ آج تو مشاعرہ ہے. جب وہ مشاعر

ے میں نہیں پہنچا تو اُس کے دوستوں کو تشویش ہوئی اور وہ اُسے لینے آ گئے۔ جب وہ مشاعرہ میں پہنچا تو اُس وقت مشاعرہ شباب پر تھا۔ اِس مبتدی شاعر کو پڑھوا کر مشاعرہ خراب نہیں کرنا تھا لیکن قمر مراد آبادی کی کوششوں سے اُس کا نام پُکار لیا گیا۔
اُس کا مخصوص انداز دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شیروانی کے آدھے بٹن کُھلے ہوئے، بالوں کی ایک آوارہ لٹ کو ایک ہاتھ سے بار بار اوپر کرتے جُھومتا ہوا سٹیج پر پہنچا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا بھر کی شرابوں کا نشہ پیکرِ اندانی میں ڈھل گیا ہے۔ اُس نے پہلے مصرعے کو دھیمے انداز میں ادا کیا۔ اِسی انداز میں دوبارہ ادا کیا لیکن دوسرا مصرعہ اِس بلند آہنگ سے پڑھا کہ لوگ آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی آواز آسمانوں کی طرف سفر کر رہی ہے۔ اُس کی شاعری کا سادہ انداز، مستی بھرا لہجہ، خلوص کی چاشنی اور منفرد تبسّم۔ چھایا تو پھر چھاتا چلا گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہے اور ہزاروں سُننے والے۔ درمیان میں کوئی شام نہیں۔ وجد کا سماں تھا اور وہ تھا۔
"اچھا تو یہ ہیں جگر!"
اِن کا نام تو سُنا تھا لیکن دیکھا آج ہے۔"
"پڑھ کیا رہا تھا! دل کو نکالے لئے جا رہا تھا۔"
مشاعر ے کے بعد ہر زبان پر یہی باتیں تھیں۔

.

اُس مشاعر ے کے بعد ارد گرد کے علاقوں سے اُس کے پاس مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے۔ اُس کی مصروفیات میں ایک اور مصروفیت کا اضافہ ہو گیا۔
مراد آباد آنے کے بعد اُس کے لاأبالی پن میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اُسے یہ سہارا ہو گیا تھا کہ وحیدن کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں ماں موجود ہے۔ لیکن ایک دن یہ سہارا بھی نہیں رہا۔ اُس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔

مراد آباد آنے کے بعد اُس کے لاأبالی پن میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اُسے یہ سہارا ہو گیا تھا کہ وحیدن کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں ماں موجود ہے۔ لیکن ایک دن یہ سہارا بھی نہیں رہا۔ اُس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ ایسا نہیں تھا کہ جگر جیسا حسّاس آدمی اِسے آسانی سے برداشت کر لیتا۔
وہ جب کسی صدمے سے لڑتا تھا، شراب کو اپنے لشکر میں شامل کر لیتا تھا۔ وہ کئی دن تک گھر نہیں آیا۔ نہ جانے کہاں بیٹھا شراب پیتا رہا اور روتا رہا۔ میری کیا حالت ہو گئی ہے۔ یہ شراب مجھ سے چُھوٹتی کیوں نہیں! میں صدموں سے مر کیوں نہیں جاتا کہ قصّہ ہی پاک ہو۔
اُسے اُس کے دوست گھر لائے تو اُس کی عجیب حالت تھی۔ کئی دن کے میلے کپڑے، بالوں میں دُھول اٹی ہوئی۔ وحیدن کو دیکھتے ہی زار و قطار رونے لگا۔
"میں تمہارا گنہگار ہوں۔ اب تک میں اماں کی وجہ سے تم سے بے خبر رہا۔ اب میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔"
"یہ کمبخت شراب چُھوٹے تب ناں!"
"ایسا مت کہو وحیدن بیگم۔ یہی تو وہ چیز ہے جو مجھے ہر گناہ کا احساس دلاتی ہے۔ یہ نہ رہی تو میں بے حِس ہو جاؤں گا۔"

شیروانی کی جیب میں اُس وقت بھی شراب موجود تھی. اُس نے بوتل نکالی اور منہ سے لگالی. نشہ ہوتے ہی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی.
یہ ہمیشہ سے اُس کی عادت تھی. شراب پینے کے بعد بے تحاشا روتا تھا اور اپنے گناہ یاد کرتا تھا. وہ بے سُدھ ہو کر بچوں کی طرح سو گیا. کتنے دن کی تھکن تھی جو اُس کی ہڈیوں میں اُتر گئی تھی. وحیدن اُس کے پاؤں دبانے بیٹھ گئی.

.

اُس نے وعدہ کیا تھا کہ اب والدہ نہیں رہیں اِس لیے گھر پر پوری توجہ د ے گا. لیکن اُس کا لاابُالی پن اب بھی جاری رہا. گھر سے غائب رہنا پھر اُس کا معمول بن گیا. جو کچھ کماتا، شراب پر خرچ ہو جاتا. اُلٹا وحیدن کا کوئی زیور بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر لیتا.
وحیدن ایک مشرقی عورت کی طرح سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر گھٹتی جا رہی تھی۔ جگر جب ہوش میں ہوتا تو اُس کی یہ حالت دیکھ کر کڑھتا لیکن مدہوش ہوتے ہی اُسے کچھ یاد نہ رہتا۔ بیماری طول پکڑتی گئی۔ ڈاکٹروں نے اسے ٹی بی بتایا تھا۔ معقول علاج نہ ہوسکا اور وہ گور کنار ے پہنچ گئی۔ جگر کو اب ہوش آیا لیکن وہ نا اُمید نہیں تھا۔

.

چشمِ اُمید میں ہے جان ابھی تھوڑی سی
ابھی دھندلا سا نظر آتا ہے اُجالا مجھے

.

اُمید کی یہ روشنی روز بہ روز کم ہوتی جا رہی تھی۔ چراغ بھڑک رہا تھا. اُسے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا جب وحیدن سے اُس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اُس بے چاری نے مجھ سے کیسی کیسی توقعات وابستہ کی ہوں گی۔ افسوس! میں اُس کی کسی توقع پر بھی پورا نہیں اُتر سکا۔
" سُنئیے " وحیدن کی کمزور آواز اُبھری۔
" کیا پانی چاہئیے؟ " جگر نے پوچھا۔
" یاد ہے؟ جب آپ ہمار ے گھر آئے تھے تو میں ضد کر کے آپ سے غزل سُنا کرتی تھی۔ "
" یاد تو ہے"۔
" آج بھی کوئی غزل سُنائیے۔"
تم سو جاؤ، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
" اسی لیے تو کہ رہی ہوں۔ کیا خبر پھر موقع ملے نہ ملے۔"
جگر کے آنسو اُس کے دل میں اُترنے لگے۔ اُس نے گھبرا کر غزل شروع کر دی۔
" ایسے نہیں۔ ترنم سے سُنائیے۔ آپ کے ترنم ہی نے تو مجھے خریدا تھا۔"
جگر نے اپنے ترنم کی قیمت کو آج محسوس کیا تھا۔ اُس نے دل کا حال لفظوں میں کہ دیا۔

.

صبر کے ساتھ مرا دل بھی لے جائیں آپ
اس قدر رحم مر ے حال پہ فرمائیں آپ

مری رگ رگ میں سما کر بھی یہ پردہ مجھ سے؟
ظلم ہے ظلم ہے، آئینے سے شرمائیں آپ

کر دیا دردِ محبت نے مرا کام تمام
اب کسی طرح کی تکلیف نہ فرمائیں آپ

نالے کرتے ہوئے رہ رہ کے یہ آتا ہے خیال
کہ مری طرح نہ دل تھام کے رہ جائیں آپ

.

اور جب وہ اس شعر پر پہنچا تو ایک ساتھ دونوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

.

دیکھئے میری تمناؤں کا احساس رہے
باغِ فردوس میں تنہا نہ چلے جائیں آپ

.

آپ کیوں روتے ہیں؟ بد نصیب تو میں ہوں کہ آپ کی شہرت کو کمال تک پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکی۔"

تم زندہ رہو اسی میں میری شہرت ہے۔"

" اب وقت آ گیا ہے۔ شاید یہیں تک آپ کا میرا ساتھ تھا۔"

وحیدن نے جگر کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اُس نے رونا چاہا مگر اُس کے آنسو خشک ہو گئے۔

.

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

.

آنکھ سے آنسو نہ بہے لیکن دل میں تو دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ لہریں گنتا رہا اور قدم ۔ ۔ ۔ گن گن کر قبرستان تک پہنچ گیا۔ سب لوٹ آئے مگر وہ وہیں کھڑا رہا۔ دم بخود، حیراں حیراں، پھر وہ دو زانو بیٹھ گیا۔ قبر کے پُھولوں میں ترنّم کے پُھول شامل کرنے کے لیے۔ قبرستان اُس کی درد بھری آواز سے سسکیاں لے رہا تھا.

.

آہ! میری یہ فغاں اب نہ سُنی جائے گی
اب نہ سُنو داستاں، اب نہ سُنی جائے گی

پِھر گئی اُن کی نظر، پِھر گئے دنیا سے وہ
دوستیِ جسم و جاں، اب نہ سُنی جائے گی

یاس بھرا دردِ دل اب نہ کہا جائے گا
درد بھری داستاں، اب نہ سُنی جائے گی

قصّۂ غم کہہ کے لیجئے خاموش ہوں
میر ے دہن میں زباں، اب نہ سُنی جائے گی

بزم سے با چشمِ تر اُٹھ گئے کہتے ہوئے
ہم سے تری داستاں، اب نہ سُنی جائے گی

رحم نہیں آ گیا میر ے دلِ زار پر
یہ روشِ آسماں، اب نہ سُنی جائے گی

کہہ کے بُرا غیر کو، اُن کو خفا کر دیا
بات جگر کی وہاں، اب نہ سُنی جائے گی

.

اُس دن کے بعد اُس کا یہ معمول ہو گیا کہ جب کوئی نئی غزل کہتا، وحیدن کو سُنانے اُس کی قبر پر پہنچ جاتا.
یہ حادثہ اُس کی شاعری میں ایک نیا موڑ لے کر آیا. اب اُس کی شاعری میں سوز و گداز بڑھ گیا تھا. اُسے وحیدن سے بڑی محبّت تھی. اُس کے بِچھڑ جانے کا کرب اُس کی شاعری میں نظر آنے لگا.

.

داغ ہی داغ نظر آتے ہیں
کس طرح قلب و جگر دیکھوں میں

آشیاں کے جو اُٹھا لوں تنکے
اپنے ٹوٹے ہوئے پر دیکھوں میں

.

اُسے اپنے ٹوٹے ہوئے پروں کا مُطلق احساس نہیں تھا. اُس کی مے نوشی بہت بڑھ گئی تھی. یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہے. سستی شراب، دن رات کی قید نہیں اور اُس میں سوڈا یا پانی ملانا گناہ سمجھتا تھا. دنیا کی ہر خبر سے بے خبر مراد آباد کی سڑکوں پر گُھومتا پِھر رہا تھا. پھر ایک دن معلوم ہوا، دیوانے کو صحرا تنگ پڑتا تھا. وہ مراد آباد سے نکل گیا. کبھی کسی شہر میں کبھی کسی سرائے میں.

.

مٹا کر اپنی ہستی، یار کی تصویر دیکھیں گے
ہم اِس تخریب میں ہی صورتِ تعمیر دیکھیں گے

.

شراب کا یہ عالم! جیسے کوئی پلا رہا تھا اور وہ پی رہا تھا. جہاں پہنچتا، اُس سے پہلے شراب وہاں پہنچ جاتی.

.

بہ غور دیکھ لو انداز میر ے مِٹنے کا
یہ سانحہ نہ کبھی پھر نظر سے گزر ے گا

.

اِس عالمِ مدہوشی میں وہ شہروں شہروں گُھومتا ہوا ایک مرتبہ پھر آگرہ آ گیا. اِس شہر میں اُسے خوشبوئے یار آتی تھی. وحیدن اُسے یہیں ملی تھی. یہاں پہنچ کر اُسے کچھ قرار آیا. اُس نے پاؤں کے چھالوں کو فرصت دینے کے لیے کچھ دن یہاں قیام کا ارادہ کیا.

وہ طرح طرح سے خود کو بہلا رہا تھا. مگر اُس کے اندر کوئی ایسا چُھپا بیٹھا تھا جو خود بھی تڑپتا تھا اور اُسے بھی تڑپاتا تھا.
ایک دن جو بے قراری بڑھی تو اُس کے قدم ایک طوائف کے گھر پہنچ گئے۔
اُس کا نام روشن فاطمہ تھا۔ حسین، شوخ، چنچل، کمسن۔
"حضور کی تعریف؟" اُس نے پوچھا۔
جگر آنکھیں جُکھائے اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ شاید نگاہ بھر کے اُسے دیکھا تک نہیں تھا۔ جواب میں دو شعر پڑھ دیے۔

.

سراپا آرزو ہوں، درد ہوں، داغِ تمنا ہوں
مجھے دنیا سے کیا مطلب کہ میں آپ اپنی دنیا ہوں

کبھی کیفِ مجسّم ہوں، کبھی شوقِ سراپا ہوں
خدا جانے کس کا درد ہوں، کس کی تمنّا ہوں

.

"سبحان اللہ" طوائف کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
بے چارے عاشق معلوم ہوتے ہیں۔
جگر نے پھر ایک شعر پڑھ دیا.

.

مُجھی میں عشق کا عالم، مُجھی میں عشق کی دنیا
نثار اپنے پہ ہو جاؤں اگر سو بار پیدا ہوں

.

"حضور اِس غریب خانے کو کیسے رونق بخشی؟"

.

کچھ ہمی جانتے ہیں لُطف ترے کُوچے کا
ورنہ پِھرنے کو تو مخلوقِ خدا پھرتی ہے

.

اِس شعر کا سُننا تھا کہ روشن فاطمہ پھڑک گئی، طوائف تھی، چہرہ شناس تھی، سُخن فہم تھی۔ بار بار اِس شعر کو پڑھتی تھی اور داد دیتی تھی۔
"میں اب تک کیوں آپ سے محروم رہی؟ کیا آپ اس شہر کے نہیں ہیں؟ ہیں تو یہاں کب سے ہیں؟ اور اب تک یہاں کیوں نہیں آئے؟"

.

جگر یہ کہتے ہوئے اُس کے سامنے بیٹھ گیا.

.

نہ پوچھ دہر میں کب سے میں اِس طرح خانہ خراب ہوں
جو نہ مٹ سکا وہ طلسم ہوں، جو نہ اُٹھ سکا وہ حجاب ہوں

.

"دیکھئے میں پاگل ہوجاؤں گی! اللہ کے واسطے آپ اپنا نام تو بتائیے! آپ ہیں کون؟؟"

.

دیکھا تھا کل جگر کو سرِ راہِ میکدہ
اِس درجہ پی گیا تھا کہ نشے میں چُور تھا

.

وہ پھر بھی نہیں سمجھی۔ شاید اُس نے جگر کا نام سُنا ہی نہیں تھا یا پھر وہ یہ سمجھی کہ وہ یہاں کہاں آئیں گے، کوئی اور جگر ہوگا۔اُسی وقت ایک مہمان اور آ گیا۔ یہ جگر کا واقف کار تھا۔ دن کا وقت تھا اِس لیے محفل گرم نہیں ہوئی تھی۔
"جگر صاحب مجھے کسی نے بتایا کہ آپ یہاں آئے ہیں۔ اور میں آپ کو تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا۔"
پھر وہ شخص روشن فاطمہ سے مخاطب ہوا۔
"آپ واقف ہیں اِن سے؟ مشہور شاعر جگر مراد آبادی ہیں۔"
"آؤ بھئی چلیں۔ میں نے بہت زحمت د ے لی اِنہیں۔" جگر نے کہا۔
"ایسے تو نہیں جانے دوں گی۔" روشن فاطمہ نے جگر کا ہاتھ تھام لیا۔
"یہ طوائف کا کوٹھا ہے۔ یہاں وہ آتا ہے جس کی جیب میں مال ہوتا ہے۔"
جگر نے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جتنے نوٹ ہاتھ میں آئے اُس کے سامنے رکھ دیے۔
"نہیں حضور! قیمت تو گاہک کی حیثیت دیکھ کر طے ہوتی ہے۔ ایسے نوٹ تو مجھے کوئی بھی جاہل سیٹھ د ے سکتا ہے۔ آپ تو مجھے غزل سُنائیں۔"
"شعر سمجھتی ہو؟"
"حضور پہلے سمجھتی ہوں پھر گاتی ہوں۔"
ابھی روشن کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ جگر کی پُرسوز آواز نے دن کو قیامت کا دن بنا دیا۔

.

کیا چیز تھی، کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی
اُف کر کے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی

کیا دیکھیں گے ہم جلوۂ محبوب کہ ہم سے
دیکھی نہ گئی دیکھنے والے کی نظر بھی

واعظ نہ ڈرا مجھ کو قیامت کی سحر سے
دیکھی ہے ان آنکھوں نے قیامت کی سحر بھی

اُس دل کے تصدّق جو محبت سے بھرا ہو
اُس درد کے صدقے جو اِدھر بھی ہو اُدھر بھی

ہے فیصلۂ عشق جو منظور، تو اُٹھیئے

اغیار بھی موجود ہیں، حاضر ہے جگر بھی
.
ملاقات کی محفل مشاعرے کی محفل بن گئی. روشن فاطمہ پر وجد کا عالم طاری تھا.اُس نے اُٹھتے وقت جگر کا ہاتھ تھام لیا.
"وعدہ کیجئے کل پھر آئیں گے."
"میں اپنے اختیار میں تو ہوں نہیں جو وعدہ کر لوں."
"میری خاطر."
اُس نے اِس ادا سے کہا کہ جگر نے وعدہ کر لیا. روشن فاطمہ اُسے دروازے تک رُخصت کرنے آئی. جگر نے اپنے اُلجھے ہوئے بالوں میں اُنگلیاں پھیریں اور باہر نکل آیا.
.
دوسرے دن پھر اُس کی مستی نے اُس کے قدموں کو سہارا دیا. بے خودی سے چونکا تو پھر روشن فاطمہ کے دروازے پر تھا. پھر یہ سلسلہ روز کا ہو گیا.
روشن فاطمہ جگر کی غزلوں سے محفل سجاتی رہی اور اندر ہی اندر جگر پر مرتی رہی. جگر کی بے نیازی یہاں بھی اُس کے ساتھ تھی. روشن اُس کی مدارات میں لگی رہتی اور وہ اپنے خیالوں میں کھویا رہتا. جب نشہ کچھ کم ہوتا اور اُسے احساس ہوتا کہ یہاں کیوں آ گیا تو دامن جھاڑ کر اُٹھ جاتا.
روشن فاطمہ اُلجھتی جا رہی تھی. دوسری جانب جگر کی تہذیب کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ وہ اظہارِ عشق کرتا. اُس کی تازہ غزلوں سے یہ معلوم ضرور ہوتا تھا کہ اُس کا دل کہیں اٹک گیا ہے. لیکن اپنی چاہت کا اظہار سُننے کے لیے روشن کے کان تھک گئے تھے.
بالآخر غرورِ حُسن نے شکستِ غرور کا اعلان کیا.
"میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی."
"میں باسی نہیں، مسافر ہوں. اُس وقت تک چلتا رہوں گا جب تک منزل نہیں مل جاتی. اور لُطف یہ کہ مجھے نہیں معلوم میری منزل کیا ہے."
"مجھے اپنے ساتھ لے چلو. اب میں یہاں نہیں رہ سکتی."
"میں نے کہا ناں، مجھے خود اپنے ٹھکانے کا علم نہیں."
"آپ کو نہ معلوم ہو. لیکن مجھے معلوم ہے، آپ کی منزل میں ہوں."
"میں شراب پیتا ہوں."
"میں آپ کو وہ نشہ دوں گی کہ آپ شراب کو ہاتھ نہیں لگائیں گے."
"تمہارے گھر والے تمہیں اتنی آسانی سے نہیں نکلنے دیں گے."
"اُن سے میں نمٹ لوں گی."
کئی دن برابر یہ تکرار ہوتی رہی اور بالآخر وہ جگر کو شیشے میں اُتارنے میں کامیاب ہو ہی گئی.
جب جگر بھی تیار ہو گیا تو ایک دن وہ نکلی اور جگر کے پاس پہنچ گئی.
جگر اُسے لے کر نکلا اور ریاض خیر آبادی کے مکان پر پہنچ گیا. اُنہوں نے کچھ سوچ کے اُسے پناہ دی.
روشن فاطمہ کے بھائیوں نے جگر کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کروا دیا اور جگر کے وارنٹ جاری ہو گئے. ریاض خیر آبادی کو معلوم ہوا تو اُنہوں نے معذرت کر لی. جگر کو یہاں سے نکلنا پڑا.

گرفتاری کا خوف، تنگ دستی اور روشن فاطمہ کا ساتھ تھا. وہ سخت خطر ے میں تھا. تکلیف میں ماں اور پردیس میں وطن یاد آتا ہے. وہ روشن فاطمہ کو لے کر مراد آباد آ گیا.
راستے میں ہی اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ روشن فاطمہ کو لے کر کہاں جائے گا.
وحیدن کا ایک رشتہ دار عاقل مراد آباد میں رہتا تھا. وہ بھی چشموں کا کاروبار کرتا تھا. اِس لیے جگر کے ساتھ اُس کے دوستانہ مراسم تھے. وہ روشن فاطمہ کو لے کر اُس کے گھر پہنچ گیا. اُس نے تمام حالات عاقل کو بتانے کے بعد کہا.
"یہ میری امانت ہے جو میں تمہار ے پاس چھوڑ ے جا رہا ہوں. میر ے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں، ذرا معاملہ کچھ دب جائے تو میں اِسے کہیں لے جاؤں گا. اِس عرصہ میں میری معاشی حالت بھی کچھ ٹھیک ہو جائے گی.
عاقل نے اُس سے وعدہ کیا کہ وہ اُس کی امانت کی حفاظت کر ے گا.
ممکن ہے عاقل کی نیت اُس وقت خراب نہ ہو لیکن روشن کے حُسن نے اُس کا ایمان ڈاواں ڈول کر دیا. اُس نے کسی طرح روشن کے بھائیوں سے رابطہ کیا اور اُنہیں بتایا کہ روشن اُس کے پاس ہے لیکن وہ حاملہ ہے. اگر وہ چاہیں تو اُس کے بچے کا باپ بننے کے لیے میں تیار ہوں. آدمی پیسے والا تھا، کچھ رقم د ے کر اُنہیں تیار کر لیا.
دوسرا کام یہ کیا کہ جگر کے خلاف روشن فاطمہ کے کان بھرنے شروع کر دیے. اُسے یہ یقین دلایا کہ جگر اُسے یہاں چھوڑ کر بھاگ گیا اور اب کبھی نہیں آئے گا.
اُس نے بھی سوچا، جس کی خاطر نکلی تھی وہ ہے نہیں، واپس جا نہیں سکتی، ایک شریف آدمی ہاتھ تھام رہا ہے تو حرج کیا ہے. عاقل نے اُس سے شادی کر لی.
جگر لوٹ آیا تو دن میں رات ہو گئی. عاقل کسی ڈھیٹ مجرم کی طرح اُس کے سامنے کھڑا تھا.
"تمہاری موت کی خبر مشہور ہو گئی لہذا میں نے روشن سے شادی کر لی."
"روشن کیونکر تیار ہو گئی؟"
"اُسے تم سے محبّت نہیں تھی. وہ اُس ماحول سے نکلنا چاہتی تھی. تمہار ے پاس نہیں میر ے پاس پہنچ گئی. اِس میں تعجّب کی کیا بات ہے؟"
"میں اُس سے ایک مرتبہ مل تو لوں."
"اب وہ میری بیوی ہے."
"مجھے معاف کرو یار! میں نے تمہاری بیوی سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا."

.

دنیائے آب و گل کی ہوا گرم ہو چلی
کُھلنے نہ پائے تھے ابھی بندِ قبائے عشق

.

عاقل کی مشقِ ستم اور روشن کی بے وفائی کا داغ ایسا لگا کہ ایک مرتبہ پھر اُس نے وطن کو خیر آباد کہہ دیا. اُس کے پاس اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ اپنے گھر چلا جاتا.

.

"اسٹیشن چلو." اُس نے ٹانگے والے سے کہا.
اور اُسے حیرت ہوئی کہ کسی سہار ے کے بغیر وہ ٹانگے میں بیٹھ گیا. زخموں کے ٹانکے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے. اپنی چیخوں کو بڑی مشکل سے اُس نے اشعار کی شکل میں ڈھال کر ترنّم بنا دیا.

.

سر میں پھر لہر، جُنوں کی صفتِ تیر چلی
اے فلک روک مرے پاؤں سے زنجیر چلی

صدقے اُن ہاتھوں کے، مجھ کو بھی خبر تک نہ ہوئی
اِس نزاکت سے گلے پر میرے شمشیر چلی

اب مری لاش پہ کیوں سوگ لیے بیٹھے ہو!
تم نے شمشیر چلائی تھی تو شمشیر چلی

.

روشن فاطمہ کو یہ خبر ملنے میں دیر نہیں لگی کہ جگر آیا تھا. یہ عقدہ کُھلنے میں بھی دیر نہیں لگی کہ عاقل نے ایک سازش کے تحت اُس سے شادی کی. یہ سب معلوم ہو جانے کے باوجود اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا. جگر کو اُس کی وفاداری کا کون یقین دلائے گا. وہ اب دوبارہ یہاں کاہے کو آئیں گے. جگر پر اب جو کچھ گزرے گی، اُس کی مجرم وہ ہو گی. اِس خیال نے اُسے لرزا دیا. دنیا سے ایسا دل اُچاٹ ہوا کہ اُس نے عاقل سے طلاق کا مطالبہ کر دیا.
"آپ مجھے طلاق دے دیں. اب میں باقی عمر اجمیر جا کر غریب نواز کی درگاہ پر گزارنا چاہتی ہوں."
عاقل نے بہت چاہا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے لیکن جب کوئی رہنا ہی نہ چاہے تو اُسے رُکنے پر مجبور کون کر سکتا ہے. عاقل کو طلاق دینی پڑی. روشن فاطمہ اجمیر چلی گئی. پھر کسی کو نہیں معلوم اُس پر کیا بِیتی.

روشن کو تو خواجہ غریب نواز کے قدموں میں جگہ مل گئی لیکن جگر کی آزمائش کے دن ابھی باقی تھے. گردشِ زمانہ اُسے جس طرف چاہ رہی تھی، اُڑائے لیے پِھر رہی تھی. اُس کی حالت، حالتِ عبرت بنی ہوئی تھی. شراب میں غرق، آنسوؤں میں تر. ابھی شاعرانہ شہرت ایسی نہیں ہوئی تھی کہ جس طرف جاتا، قدردان ہاتھوں ہاتھ لیتے. ابھی تو وہ چشموں کا بیوپاری تھا یا شراب پینے کی وجہ سے شرابی.
مختلف شہروں کی خاک چھانتا ہوا وہ لاہور پہنچ گیا. یہاں بھی چشموں کی ایک فرم میں ملازمت کر لی.
کاروباری سیاحت کے دوران اُس کی ملاقات اخبار قیصرِ ہند کے ایڈیٹر قاضی حامد حسن حسرت سے ہو گئی. اُن دنوں اُس پر دہریت کا غلبہ ہونے لگا تھا. حامد حسن حسرت سے بحث کے دوران ہی وہ طرح طرح کی دلیلوں سے اپنے عقائد کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا. بحث کے دوران اصغر گونڈوی کا ذکر بھی نکل آیا. حامد حسن صاحب نے کچھ اِس انداز میں اُن کی تعریف کی کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا.
اب اُسے ایک ہی دُھن لگی ہوئی تھی کہ گونڈہ پہنچ کر اصغر سے ملاقات کی جائے. گونڈہ جانے کا خیال ایسا طاری ہوا کہ وہ بے تاب ہو گیا. ایک دن جگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گونڈہ پہنچ گیا.

.

اصغر گونڈوی بساطی کی دکان کرتے تھے. خواجہ میر درد کے بعد تصوّف کے سب سے بڑ ے شاعر تھے.
گونڈہ پہنچ کر اصغر کو تلاش کرنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے زمین پر کھڑ ے ہو کر سورج کو دیکھ لینا. اصغر شاعر تو تھے ہی، رُشد و ہدایت کا چراغ بھی تھے. اندھیر ے میں روشن چراغ سب کو نظر آ جاتا ہے.
قدرت نے تمام انتظامات پہلے ہی مکمّل کر لیے تھے. بس جگر کے پہنچنے کی دیر تھی.
اصغر اپنی دکان میں بیٹھے کسی صاحب سے بحث کر رہے تھے.
اُس گفتگو میں دخل دینا خلافِ تہذیب تھا. لہٰذا جگر اِتنے فاصلے پر رُک گیا کہ دونوں اصحاب کی آوازیں اُس کے پردہِ سماعت تک پہنچتی رہیں. یہی قدرت کی مصلحت تھی.
گفتگو کا موضوع وہی تھا جو جگر کی اُلجھن بنا ہوا تھا. دہریت. جگر اُن دنوں اُسی دائرے کے گرد چکر کاٹ رہا تھا مگر مطمئن نہیں تھا اور نکلنے کا رستہ بھی نہیں ملتا تھا. وہ کوئی عام آدمی بھی نہیں تھا کہ معمولی دلیلیں اُسے قائل کر دیتیں.
وہ بڑی محویت سے اصغر کی باتیں سُن رہا تھا. اُن کے سمجھانے کا انداز، مضبوط دلائل، چہر ے پہ پھیلی ہوئی سچائی کی روشنی. اُس کا دل اُس کے سینے سے نکلنے لگا. اصغر کسی اور کو سمجھا رہے تھے لیکن باتیں جگر کے دل میں اُتر رہی تھیں. دیکھے بغیر عاشق ہونے کے تو کئی قصّے ہیں. لیکن بحث کیے بغیر قائل ہونے کا مظاہرہ جگر نے کیا. وہیں کھڑ ے کھڑ ے اُس نے اپنے عقائد سے توبہ کی اور راسخ العقیدہ ہو گیا.
وہ صاحب رُخصت ہوئے تو وہ اصغر کے پاس پہنچ گیا.
دونوں کی نظریں ملیں اور جگر کا پیمانہِ ضبط لبریز ہو گیا. وہ دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا. کبھی اُن کے قدموں پر پیشانی رگڑتا تھا، کبھی ہاتھ چُومتا تھا.
"میں فاسق و فاجر ہوں، مجھے پاک کر دو. میں کہیں کا نہیں رہوں گا! مجھے اپنا لو."
اصغر بڑی دیر تک مُسکرا مُسکرا کر اُس بسمل کا تڑپنا دیکھتے رہے. جب غبار دُھل گیا تو اصغر نے اُسے سہارا دے کر اپنے پاس بٹھا لیا.
.
"جگر خود چل کر میر ے پاس آیا ہے. یہ میر ے لیے اعزاز نہیں تو کیا ہے." اصغر نے کہا.
جگر پھر رونے لگا، "آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں مگر میں ایسا نہیں ہوں."
"تم کیا ہو، یہ تم ابھی نہیں جانو گے."
"میں رند ہوں. شراب مجھ سے نہیں چُھوٹتی."
"ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے."
"وہ وقت کب آئے گا؟"
"انتظار کرو."
"کربِ انتظار میں جان جانے کو ہے."
"اِسی میں تو نجات ہے."
"آپ کو مجھ سے نفرت نہیں ہوتی؟"
"اتنے اچھے شاعر سے کون نفرت کر ے گا؟ رہی تمہاری رندی، تو اللہ تعالی نیکیوں سے زیادہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے. تمہاری رُوح توبہ کی طرف مائلِ پرواز ہے. اِس لیے تم مجھے عزیز ہو."

وہ اصغر کی اعلی ظرفی پہ دنگ تھا. نہ کوئی لعن طعن، نہ نصیحت، نہ اعلانِ پارسائی. یہ مجھ سے اِس طرح مل رہے ہیں جیسے میں خزانہ ہوں اور یہ ضرورت مند.
"چلو گھر چلتے ہیں. سفر سے آئے ہو. تھک گئے ہو گے. کچھ آرام کر لو پھر باتیں ہوں گی."
وہ اُن کے ساتھ اُن کے گھر چلا گیا. عجیب پشیمانی کا عالم تھا. کیا میں اُن کے گھر کے پاک و پاکیزہ بستروں پر بیٹھنے کے قابل ہوں؟ گھر جاؤں گا تو یہ کھانا بھی کھلائیں گے. اُن کے برتنوں کو ہاتھ لگانے کے میں قابل ہوں؟ یہ تو مروّت میں سب کچھ کر رہے ہیں لیکن میں تو مجبور نہیں ہوں. اُن سے بہانہ کر کے کسی بھی طرف نکل جاؤں. بس ہو چکی ملاقات.

.

"کس سوچ میں غلطاں ہو؟" اصغر نے اُس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا. پھر خود ہی جواب دیا.
"سوچتے ہو گے جگر کی رندی اور اصغر کی پارسائی یکجا کیسے ہو گئی. بھائی یکجائی رُوحوں سے ہوتی ہے. ہو سکتا ہے تمہاری رُوح پارسا ہو."
جگر آنکھیں نیچی کیے، سر جُھکائے اُن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا. اصغر نے اُسے دیوان خانے میں آرام سے بٹھا دیا.
"میں تمہار ے غسل وغیرہ کا انتظام کرتا ہوں. تم یہاں آرام سے بیٹھو."
آرام کسے تھا. وہ تو ایسی بے آرامی سے بیٹھا ہوا تھا کہ ابھی موقع ملے اور ابھی یہاں سے بھاگ جائے. بار بار بے چینی سے پہلو بدلتا تھا.
اصغر کے کہنے پر اُس نے غسل کیا، کپڑ ے تبدیل کیے. کھانا آیا تو بڑی بے دلی سے کھانا بھی کھایا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا. تیسرے پہر آنکھ کُھلی تو شراب کی طلب ہوئی. شراب اُس کے ساتھ رہتی تھی. لیکن کیا یہاں بیٹھ کر پیوں گا؟ یہاں رہا تو پیاس کے مارے میرا دم نکل جائے گا. اِس سے پہلے کہ حضرت اصغر یہاں پہنچیں، میں یہاں سے نکل جاؤں. اُس نے عینکوں کا بیگ اُٹھایا اور چُپکے سے نکل گیا.

آدھی رات میکد ے میں اور آدھی رات سرائے میں گزارنے کے بعد دن چڑھے سو کر اُٹھا تو اپنی کج خلقی کا خیال آیا. حضرت اصغر میرے بار ے میں کیا سوچتے ہوں گے. مجھے فوراً اُن کے پاس جانا چاہئیے. اُسے پھر اپنی تشنگی کا خیال آیا. اُن کے سامنے مدہوشی میں کیسے جا سکتا ہوں! اور اگر مدہوش نہ ہوا تو جگر کیا ہوا!!
وہ شراب پی کر کبھی شعر نہیں کہتا تھا. کہہ ہی نہیں سکتا تھا. جب جذبۂ شعر متحرک ہوتا تھا تو شراب کو اُتنی دیر کے لیے خیر باد کہہ دیتا تھا جتنی دیر میں غزل مکمّل ہوتی. بس یہی اُس کا وقفۂ ہوش تھا. اُس وقت بھی وہ ہوش میں تھا اور کوئی جذبہ اُسے شعر کہنے پر اُکسا بھی رہا تھا. اُس کا تازہ محبوب اصغر تھا. کاغذ پر اُسی محبوب کی تصویر بنتی چلی گئی. وہ اپنے جذبوں کو تخلیق بنا کر اُٹھا تو اندھیرا پھیلنے لگا تھا. اندھیرا بہت ہے! کچھ تو روشنی ہو. اُس نے بوتل کو منہ سے لگا لیا.

.

رات بھیگنے لگی تھی. وہ بہت بے چین تھا. وہ ایک عالمِ محویت میں اصغر کے گھر پہنچ گیا.
اصغر اُس کی آواز پر گھبرا کر باہر نکلے.
"مجھے معلوم تھا تم کہیں چلے جاؤ، لوٹ کر یہیں آؤ گے. اصغر نے کہا.

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہئیے تھا. آپ کے سامنے اور اِس حالت میں! یہ مجھ سے کیا ہو گیا." جگر نے کہا اور پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگا.
اصغر بڑی مشکل سے اُسے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے.
"باہر کھڑ ے رہے تو تماشا بن جاؤ گے."
جگر مسلسل رو رہا تھا اور اصغر سے معافی طلب کر رہا تھا.
"میں اپنی خوشی سے نہیں پیتا. مجھے اتنے زخم لگے ہیں کہ ہوش میں رہوں تو مر جاؤں. میں فاسق ہوں، فاجر ہوں، مجھے سنبھال لو."
اصغر اُسے دلاسے دے رہے تھے اور وہ رو رہا تھا. پھر جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا.
آنسوؤں کی بارش میں اُس نے دن میں کہے ہوئے اشعار اصغر کی نذر کر دیے.
.
اپنا ہی سا اے نرگسِ مستانہ بنا دے
میں جب تجھے جانوں مجھے دیوانہ بنا دے

تُو ساقیِ مے خانہ بھی، تُو نشّہ و مے بھی
میں تشنہِ مستی، مجھے مستانہ بنا د ے

تُو ساقیِ میخانہ ہے، میں رندِ بلانوش
میر ے لیے میخانے کو پیمانہ بنا د ے

اِک برقِ ادا خِرمنِ ہستی پہ گرا کر
نظروں کو میری طُور کا افسانہ بنا د ے

یا دیدہ و دل میں مر ے تُو آپ سما جا
یا پھر دیدہ و دل ہی کو پیمانہ بنا د ے

ہر دل ہے تری بزم میں لبریزِ مےِ عشق
اِک اور بھی پیمانے سے پیمانہ بنا د ے
.
اصغر کا معنی خیز تبسّم اُس کے لیے حیران کُن تھا. اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اصغر اُسے کس نگاہ سے دیکھ رہے ہیں.
"میں دیکھ رہا ہوں، تم اور تمہاری رندی زیادہ دن ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے."
"میں نے آج ہی رندی کو خیرباد کہہ دیا."
"ابھی تم نشے میں ہو، صبح بات ہو گی."
اصغر نے اُسے بستر پر لٹا کر ایک ہلکی چادر اُس کے اوپر ڈال دی اور کمر ے سے نکل گئے.
صبح ہوئی تو اصغر کے رُوبرو اِس طرح مؤدب بیٹھا تھا جیسے مرشد کے سامنے بیٹھا ہے. اُس کے چہر ے پر وہی جلال تھا جو سلوک کی منزلیں طے کرنے کے بعد ہوتا ہے. فضا میں وہی نور تھا جو رحمتِ خداوندی جوش میں آتی ہے تو ہوتا ہے.

"مجھے سنبھالو۔ مجھے اپنے دامن میں پناہ د ے دو۔ میرا ہاتھ تھام لو۔"
اصغر کچھ دیر اُس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھتے رہے پھر اُس سے مخاطب ہوئے۔
"میر ے مرشد عبدالغنی منگلوری ہیں۔ اُن کے در پر جاؤ۔ وہ تمہاری رہنمائی کریں گے۔"

.

جگر اُسی وقت منگلور روانہ ہو گیا۔ سرائے میں اُترا، تاکہ تھکن اُتارنے کے بعد اطمینان سے پیر کی خدمت میں حاضر ہو۔

وہ یہاں پہلے بھی کسی سفر میں قیام کر چکا تھا۔ سرائے کے مالک سے واقفیت تھی۔ اُس کے ذریعے سے چند احباب اور بھی اُس کے واقف کار ہو گئے تھے۔ اُنہیں پتا چلا کہ جگر آیا ہوا ہے تو سب ملنے چلے آئے۔ جگر ہو اور شراب نہ ہو! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ احباب اُس کی پزیرائی میں مصروف ہو گئے۔ وہ پیتا رہا اور مدہوشی اُس کے قدم چُومتی رہی۔

.

ا ے اہلِ حقیقت مجھے آنکھوں پہ بٹھاؤ!
طے کر کے چلا ہوں میدانِ وفا میں

.

وہ حقیقت کی تلاش میں نکلا تھا، مجاز میں کھو گیا۔ رات بھر شاعری اور قہقہے شور مچاتے رہے۔ صبح کسی وقت آنکھ لگی۔ دن بھر سونے کے بعد شام ہوئی تو نادان دوست پھر جمع ہو گئے۔ وہ پھر دوستوں کے تقاضے سے مجبور ہو گیا۔

جب کئی دن گزر گئے تو اچانک ایک دن اُسے یاد آیا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔

.

خبر لے اپنی ا ے غارتِ ہوش
ہوا جاتا ہے تُو بھی خود فراموش

.

اُس نے اُسی وقت غسل کیا۔ نئے کپڑ ے زیب تن کیے اور باہر نکلا کہ پیر کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو۔ دیکھا کہ ایک بزرگ چند اصحاب کے ہمراہ اُس کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ فراخ چہرہ، کشادہ پیشانی، بھری ہوئی داڑھی، میانہ قد، ململ کا لانبا کُرتہ، مغلی پاجامہ، سر پر دوویلی ٹوپی۔ کسی نے بتایا، یہی تو ہیں شاہ عبدالغنی منگلوری۔

"مجھے سنبھال لو!" جگر نے پھر وہی نعرہ بلند کیا۔ جس کا ورد وہ کئی دن تک اصغر گونڈوی کی خدمت میں کرتا رہا تھا۔

"ہم تو سنگِ بے نمک ہیں۔ تم شاعر ہو، اپنی رنگینیوں میں جاؤ۔ تمہیں وہیں لُطف آئے گا۔" بزرگ نے کہا۔

جگر نے قدم پکڑ لیے۔ اُس کے آنسو اُس کا ساتھ د ے رہے تھے۔ بزرگ کو رحم آ گیا۔ اُنہوں نے جُھک کر جگر کو اُٹھایا۔

"ہمار ے ساتھ ہمار ے گھر چلو۔"

عجیب منظر تھا۔ ایک رندِ بلانوش ایک صاحبِ کشف بزرگ کی ہمراہی میں، خود اُن کی دعوت پر اُن کے گھر جا رہا تھا۔

وہ اُن بزرگ کا مہمان تھا۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ زبان سے یہ کہنے کی ہمّت نہیں تھی کہ کس لیے آیا تھا۔ رمضان آ گیا۔ بالآخر وہ ہمّت کر کے اُن کے پاس پہنچا۔

"الوداع پر آنا۔" بزرگ کا ارشاد ہوا۔
وہ آنکھیں جُھکائے بیٹھا تھا، گردن جُھکا کر اُٹھ گیا۔ مرشد کا حکم تھا۔ اختلاف کی تاب کسے تھی۔

اب الوداع کا انتظار تھا۔ وقت جوں توں کاٹا۔ انتظار کا صحیح لُطف اُس پر کھلا۔
.
نظر ہے وقف غمِ انتظار کیا کہنا
کھنچی ہے سامنے تصویرِ یار کیا کہنا

حریمِ حُسن کے پرد ے اُٹھے ہوئے ہیں جگر
یہی اگر ہے غمِ انتظار، کیا کہنا
.
الوداع کا دن آ گیا۔ الوداع کی نماز پڑھی اور شاہ صاحب کے سامنے پہنچ گیا۔ ہمّت اب بھی نہیں ہوئی کہ اظہارِ مطلب کرتا۔
"جاؤ بھائی آرام کر لو۔" شاہ صاحب نے فرمایا۔
وہ اُلٹے قدموں لوٹ آیا۔ اپنے بستر پر آ کے لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ چشمِ کرم سے اب بھی محروم رہا۔ آخر اور کون سا وقت آئے گا۔ یہی سوچتے سوچتے نیند کے جھونکے آنے لگے۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک روشنی تھی جس کے درمیان وہ تیر رہا تھا۔ یہ روشنی بڑھتی گئی۔ پھر وہ بلند آواز سے کلمہ پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔
آنکھ کھلی تو شاہ عبدالغنی منگلوری اُس کے سامنے کھڑ ے تھے۔
"جاؤ بھائی، وقت آ گیا ہے۔ وضو کر کے آؤ۔"
یہاں اُٹھنے کی تاب کسے تھی۔ پورا بدن پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ بڑی ہمّت کر کے اُٹھا اور وضو کر کے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُنھوں نے اپنے ہاتھ پر اُسے بیعت کیا۔ چند نصیحتیں کیں اور اُسے رُخصت کر دیا۔
.
مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے
لے جائے جذبِ شوق مرا اب جدھر مجھے

وہاں سے نکلنے کے بعد اُس کی سیاحت پھر شروع ہو گئی۔ وہ اپنی توبہ پر چند دن ہی قائم رہ سکا۔ ایک مشاعر ے میں دوستوں نے پھر اُسے مجبور کر دیا۔
اب تک پینے کے بعد اُسے یہ فکر ہوتی تھی کہ اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اب یہ بھی فکر ہونے لگی کہ پِیر کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ اُن کے سامنے نہ بھی گیا تو بھی اُنہیں خبر تو ضرور ہو جائے گی۔ وہ ہر بار توبہ کرتا، ہر بار توڑ دیتا۔ پھر اُس نے ہوش کی کشتی کو مدہوشی کی موجوں میں غرق کر دیا۔ یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا کہ کس نے کس سے وعدہ کیا تھا۔
اُس نے خود کو سستی شراب کا عادی کر لیا تھا۔ بقول اُس کے یہ اِس لیے کہ پلانے والوں پر بوجھ نہ پڑ ے۔ اِس سہولت کا اُس کے پرستار خوب خوب فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ ایک بوتل کے عِوض اُس سے رات رات بھر غزلیں سُنتے۔ جہاں چاہتے اُسے لیے پھرتے۔ اُس نے بھی لنگر اُٹھا لیا تھا۔ کٹی پتنگ بن گیا تھا۔ جس کے ہاتھ میں اُس کی ڈور آ جاتی، اُچک لیتا۔ اُس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

روشن فاطمہ کی بے وفائی کا داغ اب تک اُس کے دل پر تھا. جب وطن ہی چُھوٹ گیا تو پھر غریب الوطنی کے دن بھی گزر جائیں گے. یادوں کے ہجوم میں، احباب کی بِھیڑ میں. خود سے غافل، زمانے سے بے خبر. ایک شہر سے دوسر ے شہر. اپنی دُھن میں گُھومتا پِھر رہا تھا.

.

گُھومتا گُھومتا پھر اصغر گونڈوی کی محفل میں پہنچ گیا. اُنہوں نے پھر وہی جملہ دہرایا.
"کہیں بھی چلے جاؤ، لوٹ کر یہیں آؤ گے."
وہ مؤدب سر جُھکائے بیٹھا تھا اور اصغر صاحب کبھی مُسکرا کر تو کبھی ڈانٹ کر اُسے نصیحت کر رہے تھے.
"یہ سب تمہار ے شعر نہیں سُنتے، تمہارا گوشت کھاتے ہیں. تمہیں گھٹیا شراب پلا پلا کر اپنی محفلیں سجاتے ہیں اور پھر یکّے پر لاد کر یہاں چھوڑ جاتے ہیں. خدارا سنبھلو! یہ تمہارا مقام نہیں ہے."
کچھ دیر بعد وہ خود بھی رویا اور اصغر کو بھی رُلایا. جب کچھ دل ہلکا ہوا تو کھڑا ہو گیا جیسے پھر کسی مہم پر جانے کی تیّاری ہو.
"اب کہاں چلے؟"
"دل گھبراتا ہے."
"جاؤ مگر اب ہم نے کچھ اور سوچا ہے." اصغر نے کہا.

.

اُنہوں نے سوچا اگر جگر کی شادی کرا دی جائے تو اُس کے مزاج میں ٹھہراؤ آ جائے گا. اُس کی آوارگی ختم ہو جائے گی. اُس کی رُوح نیک ہے، وہ بُرا نہیں ہے، بُرائی کی طرف چلا گیا ہے. ذمہ داری پڑ ے گی تو راہِ راست پر آ جائے گا. اکثر بزرگ یہی سوچتے ہیں. اُنہوں نے بھی اگر سوچا تو کیا غلط سوچا.
اُن کی ایک سالی تھی، جس کا نام نسیم تھا. اصغر نے سوچا جگر کی شادی نسیم سے کرا دی جائے. اِس طرح جگر کا گھر بھی بس جائے گا اور وہ اُن کی نگرانی میں بھی رہے گا. دراصل وہ جگر سے بے انتہا محبّت کرتے تھے. اِس محبّت کا تقاضہ تھا کہ جگر زیادہ سے زیادہ اُن کے قریب رہے. یہ رشتہ داری اُنہیں یہ موقع د ے سکتی تھی.
اُن کی توقع کے عین مطابق اِس رشتہ کی مُخالفت ہوئی لیکن اُنہوں نے کسی نہ کسی طرح سب کو تیار کر ہی لیا. جگر کی طرف سے اُنہیں فکر نہیں تھی. وہ اُن کی خواہش کو ٹھکرا نہیں سکتا تھا.
اب اُنہیں جگر کا انتظار تھا کہ دیکھو کب پھیرا لگتا ہے. ایک دن اُسے ایک تانگے والا اصغر کے گھر چھوڑ کر چلا گیا.
"میں یہاں تمہار ے لیے کیا کیا جتن کر رہا ہوں اور تم ہو کہ اپنی حرکتوں سے باز ہی نہیں آتے."
جگر حسبِ معمول سر جُھکائے بیٹھا تھا.
"میں نے نسیم سے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے." اصغر نے کہا.
"اچھا."
"کیا اچھا. تم تیّار بھی ہو یا نہیں؟"
"آپ کیا کہتے ہیں."
"مجھے کیا کہنا ہے. مجھے تو یہی مناسب لگا."
"جیسا حکم."

"لیکن تمہیں اپنی عادتیں بدلنا ہوں گی."
"ٹھیک ہے."
"شراب پیتے رہے تو گھر نہیں چلے گا."
"چھوڑ دوں گا."
جگر کے پاس کیا تھا جو شادی پر خرچ کرتا. اصغر نے اپنے خرچ پر نہایت سادگی سے اُن کی شادی کر دی.
شادی کے بعد کچھ دن تو یہ معلوم ہوا جیسے وہ بدل گیا ہے. لیکن جلد ہی اپنی دنیا میں واپس لوٹ گیا. کئی کئی دن گھر سے غائب رہنا اُس کا معمول بن گیا. جو کچھ کماتا، پیمانے میں غرق کر دیتا. نسیم ایک با شرع گھرانے کی لڑکی تھی. اُسے جگر کی ہر ادا پسند تھی. لیکن وہ اُس کے شراب پینے کو پسند نہیں کر سکتی تھی. وہ بہانے بہانے سے اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا کرتی تھی. جگر کو اُس کی ہر بات تسلیم بھی تھی. اُس کے سامنے روتا بھی تھا، اپنے آپ کو بُرا بھلا بھی کہتا، گڑگڑا کر دعائیں بھی کرتا تھا لیکن اُسے خود پر اختیار نہیں تھا. وہ خود پر قابو پا بھی لیتا تو پرستار مجبور کر دیتے. اُس نے کئی مرتبہ توبہ کی لیکن ہر مرتبہ توبہ توڑنے کے لیے توبہ کی.
.
نسیم نے کہنا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ خوش بھی نہیں تھی. اُس کی ناخوشی کا علم اُس کی بڑی بہن یعنی اصغر کی بیوی کو بھی تھا. نسیم اپنا دُکھڑا اپنی بڑی بہن کے آگے روتی تھی. اصغر الگ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگ گئے تھے. اُن کا اندازہ غلط نکلا تھا. وہ سمجھ رہے تھے کہ شادی کے بعد جگر شراب چھوڑ د ے گا لیکن یہ اُن کا خیال تھا. شہرت کے ساتھ ساتھ اُس کی شراب نوشی میں اِضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا. یہ چیز ہی ایسی تھی کہ جس نے جگر کی تمام خوبیوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا. جگر جیسا مہذب رند اُردو شاعری کو کبھی نصیب نہیں ہوگا. وہ نشے کی حالت میں بھی انسانیت اور وضع داری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا. کسی کا دُکھ اُس سے دیکھا نہیں جاتا تھا. کسی کی بُرائی یا عیب نکالنا تو گویا اُسے آتا ہی نہیں تھا. ایسا راست کردار تھا وہ رند مگر شراب تو شراب ہے. نسیم کا کہنا تھا کہ اُن میں کوئی خوبی نہ ہوتی، وہ اُسے برداشت تھے. لیکن اُن کی شراب نوشی برداشت نہیں ہوتی.
.
ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ نسیم نے اُس کے برتن الگ کر دیے. اُس کا بستر الگ ہو گیا. اُس نے ذرا بھی شکایت نہیں کی بلکہ یہی کہتا رہا "نسیم میں ہوں بھی اِسی قابل. تم بیوی ہو کر مجھ سے اِتنا خفا ہو تو میرا اللہ مجھ سے کتنا خفا ہوگا."
"جب اتنا بُرا سمجھتے ہیں اور اللہ کی ناراضی کا اتنا ڈر ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"
"بس آج سے ختم! اب نہیں پیوں گا."
دو ایک روز اُس توبہ پر عمل بھی ہوتا لیکن پھر کسی سفر سے لوٹ کر آتا یا کسی مشاعر ے سے واپسی ہوتی تو "ظالم شراب ہے! ار ے ظالم شراب ہے! کہتے ہوئے گھر میں داخل ہوتا.
یہ کشیدگی اتنی بڑھی کہ نباہ کا کوئی راستہ باقی نہ رہا. نسیم اب صرف اِس شرط پر جگر کے ساتھ رہنے پر تیّار تھی کہ وہ شراب چھوڑ د ے اور یہ ممکن نہیں تھا.
ایک دن اصغر کی بیوی اور نسیم کے درمیان دیر تک باتیں ہوتی رہیں. دونوں بہنیں کسی نتیجہ پر پہنچ گئیں تو نسیم اپنے گھر چلی گئی.
"کیا کہہ رہی تھی نسیم؟ آج بہت پریشان معلوم ہو رہی تھی."

"جگر کی طرف سے بہت پریشان ہے. محبّت بھی بہت کرتی ہے اور اُس کی رندی بھی اُسے برداشت نہیں."
"بیگم ہم خود بہت شرمندہ ہیں. نسیم سے آنکھ ملانے کی ہمّت نہیں ہوتی. سچ تو یہ ہے کہ ہم نے ہی اُسے پھنسوا دیا."
جگر جیسا شریف النفس آدمی شراب چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟"
"اُس سے شراب نہیں چُھوٹنے کی."
"ہاں!"
"مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟"
"ہو تو سکتا ہے. اِس پر میں نے غور بھی کیا ہے بلکہ نسیم نے اپنا خیال ظاہر بھی کر دیا ہے. اگر آپ بھی تیّار ہو جائیں تو میری تجویز معقول ہے."
"بات ماننے کی ہوئی تو ضرور مانیں گے."
"میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں اور اب کوئی اُمید بھی نہیں ہے. آپ مجھے طلاق د ے دیں. جگر سے کہیں وہ نسیم کو طلاق د ے د ے. پھر آپ نسیم سے شادی کر لیں. شاید اللہ تعالی آپ کو اُس سے اولاد د ے د ے."
"یہی تھی آپ کی تجویز. دو گھروں کو برباد کروں تو اولاد پاؤں. سبحان اللہ!"
"نسیم کا گھر آباد ہی کب ہے! وہ جگر سے خوش نہیں ہے."
"اور آپ؟"
"اِسے آپ بہن کی خاطر میرا ایثار کہہ سکتے ہیں ورنہ میں آپ سے بہت خوش ہوں."
"میں اپنی خوشی کے لیے تمہیں برباد نہیں کر سکتا."
"میری بربادی کہاں سے آ گئی؟ میں تو گزار چکی. میں نے بہت عیش دیکھ لیے تمہار ے گھر میں."
"کچھ بھی ہو، میں اِس کے لیے تیّار نہیں."
"طلاق مانگنا میرا حق ہے. میں خود طلاق مانگ رہی ہوں."
اُن کی بیوی نے اتنی ضد کی اور اِس سنجیدگی سے کی کہ وہ مجبور ہو گئے.
"اچھا میں جگر سے بات کروں گا. کیا خبر وہ طلاق د ے بھی یا نہیں."
"آپ کہہ کے تو دیکھیں."
اصغر نے جگر کو بُلا بھیجا. وہ حسبِ معمول سر جُھکا کر بیٹھ گیا. وہ اصغر کے سامنے اِسی طرح مؤدب ہو کر بیٹھا رہتا تھا، ہوں ہاں سے زیادہ بات ہی نہیں کرتا تھا.
"جگر کیا نسیم تم سے خوش نہیں ہے؟"
"کوشش تو بہت کرتا ہوں، لیکن شاید خوش نہیں ہے."
"جب کوئی خوش نہیں ہے تو زبردستی ساتھ رکھنے کا کیا فائدہ؟ آزاد کر دو اُسے."
"یہ حکم ہے آپ کا؟"
"مشورہ ہے."
"بہتر ہے. ایسا ہی ہوگا."
جگر نے کوئی بحث نہیں کی. کچھ دیر نہیں لگائی. حالانکہ وہ طلاق دینے پر تیّار نہیں تھا لیکن اصغر کا حکم تھا جنہیں وہ مرشد کا درجہ دیتا تھا.
جگر نے نسیم کو طلاق د ے دی اور عدّت کے دن گزارنے کے بعد اصغر نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور نسیم سے شادی کر لی.

مرشد کا حکم ضرور تھا. جگر نے اُسے تسلیم بھی کیا لیکن اُس کے دل پر جو چوٹ پڑی اُس نے اُسے بے حال کر دیا. وہ گونڈہ سے نکل کھڑا ہوا.
یہ اُس کی زندگی کا بدترین دور تھا. جتنی شراب اُس نے اُس دور میں پی، کبھی نہیں پی ہوگی. گھٹیا شراب سے لے کر اسپرٹ تک، جو ملا اُس نے حلق سے اُتار لیا.

.

جگر کی بادہ کشی اِن دنوں معاذ اللہ
جب آپ دیکھیں گے، غرقِ شراب دیکھیں گے

وہ سلطان پور کی سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا. غلام محمد آغا عینک فروش بھی وہاں ٹھہر ے ہوئے تھے. دونوں میں پُرانی واقفیت تھی.
آغا صاحب کو اُس کی موجودگی کا علم نہیں تھا لیکن ایک دن اُنہوں نے سرائے میں کچھ لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے سُنا. وہ کہہ رہے تھے، ایک عجیب مولوی آیا ہوا ہے جو اعلانیہ شراب پیتا ہے. جگر کی داڑھی کی وجہ سے وہ اُسے مولوی سمجھ رہے تھے.
آغا کو شک ہوا کہ مولوی کے پرد ے میں کہیں جگر تو نہیں. وہ اُسے دیکھنے گئے اور اُن کا اندازہ درست نکلا. وہ کمبل اوڑھے لیٹا تھا. آغا نے آواز دی اور اُس نے آنکھیں کھول کر آغا کی طرف دیکھا.
"جگر کس حال میں پڑ ے ہو!"

.

ا ے کاش وہ حسرت زدہ طُور کو ملتی
جس آنکھ سے ہم حُسنِ بُتاں دیکھ رہے ہیں

.

جگر نے شعر پڑھا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا. آغا کی طرف دیکھا اور پھر اُسے پہچان کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا.
"تمہیں تو بُخار ہے!"
"مدہوشی کا یہی تو فائدہ ہے. مجھے بُخار ہے اور مجھے معلوم ہی نہیں."
"میں اعظم گڑھ جا رہا ہوں. چلو گے میر ے ساتھ؟"
"پوچھتے کیوں ہو بھائی.کچھ دن وہاں بھی سہی. ایک داغ وہاں سے بھی لے کر اُٹھیں گے."

.

وہ آغا کے ساتھ اعظم گڑھ آ گیا. یہاں ایک صاحب اقبال سہیل تھے جن کا معیارِ شعر بہت بُلند تھا. مشکل ہی سے کسی کو شاعر تسلیم کرتے تھے. آغا عینک فروش جگر کو اُن سے ملوانے لے گئے. جگر کی آمد کا سُن کر چند مقامی شعرا بھی وہاں پہنچ گئے.
جگر نے تازہ غزل کہی تھی، وہی سُنا دی.

.

اِس درجہ بے قرار تھے دردِ نہاں سے ہم
کچھ دور اور بڑھ گئے عمرِ رواں سے ہم

کب تک رہیں گے دور تر ے آستاں سے ہم

اب پہنچے شرط باند کے عمرِ رواں سے ہم

ا ے چارہ ساز! حالتِ دردِ نہاں نہ پوچھ
اک راز ہے جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم

بیٹھے ہی بیٹھے آ گیا کیا جانے کیا خیال
پہروں لپٹ کے روئے دلِ ناتواں سے ہم

بے تابیوں نے کام کر دیا دستِ ناز کا
آخر لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم

.

محفل پر وجد طاری ہو گیا. کچھ اُس کے ترنّم پر مر مِٹے تو کچھ اُس کی حالت پر. کچھ ایسے تھے جنہیں اُس کے شاعر ہونے میں شک تھا.
"ایسا سُریلا شاعر ہم نے آج تک نہیں دیکھا. ہندوستان بھر میں ایسا ترنّم کسی کا نہیں ہوگا."
"اِسی لیے تو ہم کہتے ہیں، اِس ترنّم کا فائدہ اُٹھا کر کوئی اِسے غزلیں لکھ کر دے رہا ہے."
"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے! طرحی مشاعرہ رکھ کر دیکھ لو. ہو جائے گی آزمائش. دیکھ لیں گے وہاں کتنے پانی میں ہے."
فیصلہ ہو گیا. طرح د ے دی گئی. مشاعر ے کی تاریخ کا اعلان بھی ہو گیا.
جگر طرحی مشاعروں کا مُخالف تھا. وہ کہتا تھا کہ طرح پر شعر کہلوانا بُلبل کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے لیکن یہاں مسئلہ کچھ اور تھا! لہٰذا اُسے غزل کہنا پڑی.
اُس نے غزل کہی اور ایسی کہی کہ اعظم گڑھ میں کوئی ایسا نہیں تھا جس نے اُس کے ہاتھ نہ چُومے ہوں. اور شاید اُسی مشاعر ے سے اُس کی شہرت کا آغاز بھی ہوا اور اُسے یہ شوق بھی ہوا کہ وہ مشہور ہو. اور پھر اُس کا ترنّم!

.

کیا آ گیا خیال دلِ بے قرار میں
خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں

محشر میں عرضِ شوق کی اُمّید کیا رکھوں
دل ہی تو ہے، رہا نہ رہا اختیار میں

دستِ جُنونِ عشق کی گل کاریاں نہ پوچھ
ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

رگ رگ میں، دل ہی دل میں تڑپ دردِ عشق کی
محشر بنا ہوا ہوں تمنّائے یار میں

تھم تھم کے دل سے چھیڑ نہ ہو تیرِ نگاہ کی

کیا لُطف جب ہمی نہ رہے اختیار میں

.

وہ تو جوگی تھا. ایک جگہ اُس کا دل لگتا ہی نہیں تھا. طبیعت میں عجیب سا اضطراب تھا جو اُسے ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتا تھا. پاؤں اُٹھ جاتے تو پھر بڑی سے بڑی ترغیب اُسے روک نہیں سکتی تھی. اعظم گڑھ میں ابھی لوگوں کا دل اُس سے بھرا نہیں تھا کہ ایک دن اُس نے عینکوں کا بکس اُٹھایا اور اعظم گڑھ سے نکل گیا. اِس طرح نکلا کہ آغا عینک فروش کو بھی خبر نہ ہوئی.

.

مُختلف شہروں کی خاک چھانتا ہوا ایک دن کانپور پہنچ گیا. شہر میں مشاعرہ تھا. اُس نے بھی سستی سی ایک سرائے میں قیام کیا. چشموں کا بکس وہیں رکھا اور مشاعر ے میں پہنچ گیا. کچھ لوگ اُسے جانتے تھے، کچھ نہیں جانتے تھے. بڑی مشکل سے اُس نے شعرا کی فہرست میں اپنا نام شامل کرایا اور ایک طرف بیٹھ گیا. اُس کی باری آئی اور وہ جُھومتا ہوا پہنچ گیا. اُس کے ہونٹوں پر وہی دلفریب مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جو ایسے موقعوں پر اُس کے ہونٹوں کا حُسن بن جاتی تھی. دراصل اُسے معلوم ہوتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے. وہ جادو کرے گا اور لوگ تڑپنے لگیں گے. کہیں اور ایسا ہوا یا نہیں لیکن کانپور میں ضرور ہوا. اُس نے مطلع پڑھا.

.

فلک کے جور، زمانے کے غم اُٹھائے ہوئے
ہمیں بہت نہ ستاؤ کہ ہیں ستائے ہوئے

.

اُس کے بعد مشکل سے ایک شعر اور پڑھا ہوگا کہ جادو کام کر گیا. مقامی شاعر وحشی کانپوری نے جُھر جُھری سی لی اور اُن پر وجد طاری ہو گیا. کچھ دیر بیٹھے جُھومتے رہے اور پھر باقاعدہ فرش پر لوٹنے لگے. بزمِ مشاعرہ قوالی کی محفل بن گئی. جس طرح قوال ایک شعر کی تکرار کرتے ہیں، اُس طرح جگر کو بھی مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ ایک ایک شعر کو بار بار پڑھے. بلا مبالغہ ایک ایک شعر کو اُس نے دس دس مرتبہ پڑھا. جب پڑھنے اور سُننے والے دونوں بے دم ہو گئے تب کہیں یہ سلسلہ تھما. اُس نے ایک ہی مشاعرے میں کانپور فتح کر لیا.
شاعروں نے اُس کے قدموں میں پڑاؤ ڈال دیا. یہ حال تھا گویا

.

پہلے شراب زیست تھی، اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے، پئے جا رہا ہوں میں

.

ایسے ایسے ثقہ حضرات جنہوں نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، اُس کی دلداری کے لیے شراب لے کر آ رہے تھے. وہ سر سے پاؤں تک شراب میں ڈوب گیا تھا.
ایسا شرابی کس نے کاہے کو دیکھا تھا! مدہوشی میں بھی مجال ہے کوئی بات خلافِ تہذیب منہ سے نکل جائے یا وضع داری میں فرق آ جائے. اُس کے اعلی کردار نے سب کا دل موہ لیا تھا.

.

ایک دن ایک نوجوان اُس سے ملنے آیا. بے روزگار تھا اور نہایت پریشان.
"جگر صاحب آپ کے بہت تعلقات ہیں. میری نوکری کا بندوبست کر دیجئے."
"میاں نوکری میں کیا رکھا ہے؟ تجارت کرو تجارت!"

"تجارت کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور میر ے پاس پُھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"
اُس کی تم فکر مت کرو۔"
اُس کے لیے شیشے کا نہایت خوبصورت بکس بنوایا اور قیمتی چشمے اُس کے حوالے کیے۔
"لو میاں، اِسے بیچ کر روزی پیدا کرو۔"
وہ بھی غالباً اُسی کی طرح پردیسی تھا کہ رہنے کا ٹھکانہ تک نہیں تھا۔ اُسے اپنے پاس ہی ٹھہرا لیا۔
اُس نوجوان نے جب یہ دیکھا کہ یہ سیدھے آدمی ہیں، ہر وقت نشے میں بھی رہتے ہیں تو اُس کی نیّت خراب ہو گئی۔ ایک دن اُس نے اپنے ساتھ اُس کا بھی بکس اُٹھا لیا۔ کچھ رقم رکھی تھی، وہ اُڑائی اور غائب ہو گیا۔
احباب ملنے آئے تو جگر پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دوستوں سے اپنے دوست کی شکایت کیسے کر ے۔ دوستوں نے خود ہی بھانپ لیا۔
"آپ کے وہ دوست نظر نہیں آ رہے ہیں جن کو آپ نے کاروبار کرایا تھا۔ کل بھی نہیں تھے۔"
"ہاں صاحب، میں خود بھی اُن کی خیریت کی طرف سے پریشان ہوں۔ میرا بھی کچھ سامان لے گئے ہیں۔ لوٹ کر نہیں آئے۔"
"کیا سامان لے گئے ہیں؟"
"کچھ نہیں۔ کچھ روپے تھے۔ ایک گھڑی تھی۔ ایک شیروانی نئی سلوائی تھی۔ چشموں کا بکس تھا۔"
"سب ہی کچھ تو لے گئے۔ آپ کہہ رہے ہیں، کچھ نہیں۔"
"وہ تو شکل ہی سے چور لگتا تھا۔ اب نہیں آنے والا۔" ایک اور صاحب نے کہا۔
کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ۔ جگر کے چہر ے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سخت اذیت میں ہے۔
اُسے یہ باتیں ناگوار گزر رہی تھیں۔ جب لوگ بُرا بھلا کہنے لگے تو اُس سے رہا نہیں گیا۔
"بس جناب بس۔ جو شخص سامنے نہیں ہے اُس کی بُرائی کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ آپ کو یا مجھے کیا معلوم اُس کی کیا مجبوری تھی۔ کیا خبر اُس نے یہ کام کسی مجبوری سے کیا ہو۔"
احباب سوائے چُپ ہو جانے کے کیا کر سکتے تھے۔ ہاں یہ کر سکتے تھے کہ جگر کی مدد کر دیں۔ اُس نے پھر نیا بکس بنوا لیا۔
ایک دن غزل کہتے ہوئے اصغر کی یاد آ گئی اور اُس سے یہ شعر سرزد ہو گیا۔

.

کیا دن تھے جگر وہ بھی جب صحبتِ اصغر میں
مسرور طبیعت تھی، مسرور مرا دل تھا

.

چند دن نہیں گزر ے ایک غزل میں یہ شعر ہو گیا۔

.

تجھ سے غافل تر ے وحشی نہیں ہونے پاتے
روز آ کر کوئی زنجیر ہلا دیتا ہے

.

پے در پے ہونے والے اشاروں نے اُس کا دل اُچاٹ کر دیا۔ اُسے احساس ہوا جیسے کہیں سے بُلاوا آیا ہے۔ وہ ایک رات کانپور سے روانہ ہو کر اصغر کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔

وہ ایک رات کانپور سے روانہ ہو کر اصغر کی بارگاہ میں پہنچ گیا. اُسی طرح مؤدب، سر جُھکائے مرشد کے حضور مریدِ عاجز.
"خوب سیاحت ہو رہی ہے." اصغر نے کہا.
"ہوں."
"جگر کچھ بولا کرو. دوستوں میں تو خوب چہکتے ہو."
اِس بات کا جگر کے پاس کچھ جواب نہیں تھا. اصغر نے پھر بات کو آگے بڑھایا. "چلو نہ بولا کرو مگر آیا جایا کرو. ایک رسالے میں تمہاری غزل دیکھی تھی. بہت اچھی غزل تھی. مگر یہ مشاعرے بازی کم کر دو ورنہ تمہار ے نادان دوست تمہیں شراب پلا پلا کر مار دیں گے."
"اچھا."
"شاہ عبدالغنی قدس سرہ کی طرف گئے تھے؟"
"کس منہ سے جاؤں! شراب تو چُھوٹتی نہیں."
"تم اتنے بے اختیار کیوں ہو؟"
"آپ بھی تو دعا نہیں کرتے. آپ چاہتے ہی نہیں. آپ کو میری فکر کیوں نہیں ہے؟"
وہ آ تو ضرور گیا تھا مگر اِس طرح گھبرایا ہوا تھا جیسے کوئی زبردستی اُسے یہاں لے کر آیا ہے. اور ابھی یہاں سے اُٹھ جائے گا.
کھانا تیّار تھا لیکن جگر نے معذوری ظاہر کی. اصغر بگڑے بھی لیکن جگر بے دلی سے در و دیوار تکتا رہا. اور پھر اُٹھ کھڑا ہو گیا.
"جاؤ گے؟"
"پھر آؤں گا."
یہاں بیٹھ کر اُکھڑا اُکھڑا تو وہ ہمیشہ رہتا تھا لیکن آج اُسے یہاں پہنچتے ہی نسیم کی یاد آ گئی تھی. نسیم، جسے وہ کبھی نسیمِ جگر لکھتا تھا، اب اصغر کی بیوی تھی. وہ ابھی اُس کی یادوں کے بھنور سے نکل نہیں سکا تھا. بس اب وہ یہاں مزید رُک نہیں سکتا تھا.
اب کہ جو گیا تو بدایون پہنچ گیا. یہاں بھی ایک سرائے میں ٹھہر گیا. ابھی اُس کی شہرت اتنی نہیں ہوئی تھی کہ لوگ اُسے دیکھتے ہی پہچان لیتے.

.

بدایون شعرا کا گڑھ تھا. آئے دن مشاعرے ہوتے تھے. وہ بھی ایک مشاعر ے میں بِن بُلایا مہمان بن کر پہنچ گیا. جادوگر نے جادو دکھایا. دوسر ے ہی دن قدر دانوں کا ہجوم لگ گیا. بدایون کے جتنے اُستاد شعرا تھے، اُنہوں نے اُسے سر آنکھوں پر بٹھایا.
بدایون کے قیام نے اُسے بہت شہرت دی. یہاں اُس نے تین سال گزارے. بدایونی شعرا کے ساتھ بیرونی مشاعرے بھی پڑھے اور اُس کی شہرت پھیلنے لگی. اب اُس کا نام مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا.
جھانسی سے دعوت نامہ آیا تھا. بہت اصرار کر کے بُلایا گیا تھا. لہذا وہ بدایون سے نکلا اور جھانسی پہنچ گیا.
جگر سے پہلے ایک مولوی صاحب یہاں آئے ہوئے تھے. اُن کے وعظوں کی بڑی دُھوم مچی ہوئی تھی لیکن جگر کے پہنچتے ہی اُن کی مجلسیں پھیکی پڑ گئیں. جگر کی شان میں جگہ جگہ مشاعر ے ہو رہے تھے اور لوگ جوق در جوق اُسے سُننے کے لیے پہنچ رہے تھے. اُس کے پڑھنے کا خاص انداز، عاشقانہ اشعار اور اُس کی وضع قطع ہر جگہ مرکزِ نگاہ بن جاتی تھی. یہاں بھی دُھوم

مچی ہوئی تھی. مولوی صاحب اِس صورتِ حال سے بے حد برافروختہ تھے. اب وہ اپنی تقریروں میں جگر کے خلاف خوب زہر اُگلنے لگے تھے. اُنہیں عوام سے سخت شکایت تھی کہ وہ اِس فاسق و فاجر شاعر کا کلام سُننے کیوں جاتے ہیں لیکن لوگوں پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا.

.

ایک روز ایک جگہ مشاعرہ تھا، جہاں سے مولوی صاحب کا گھر قریب تھا. وہ اُس مشاعر ے کو روک تو نہیں سکتے تھے لیکن گھر کی کھڑکیاں بند کر کے بیٹھ گئے.

اُس مشاعر ے کی صدارت جگر کو کرنی تھی. وکیل مبارک علی کا بیٹا اُنہیں لینے کے لیے آ گیا.

"بھائی ایسے کیا مزہ آئے گا! ذرا حلق تر کر لیں، پھر چلتے ہیں." جگر نے کہا اور پینے بیٹھ گیا.

شراب کم تھی اور پیاس زیادہ.

"چلو میکدے چلتے ہیں." جگر نے کہا اور اُسے لے کر ایک شراب خانے میں آ گئے.

نشہ تو گھر پہ ہو گیا تھا، مے خانے میں آ کر بے تحاشا پی گئے. بہکنے لگے. غضب یہ ہوا کہ میزبان نے وقت گزاری کے لیے بحث چھیڑ دی. بحث یہ تھی کہ ہر انسان کو بالآخر خاک میں مل جانا ہے.

"جب ایک دن خاک میں مل کر خاک ہو جانا ہے تو پھر آج ہی کیوں نہیں!" جگر نے کہا اور بے اختیار زمین پر لوٹنا شروع کر دیا.

میزبان روکتا رہا اور وہ لوٹتے رہے. تھوڑی دیر میں حالت یہ ہو گئی کہ پہچاننا مشکل تھا. پورا بدن مٹی سے اٹ گیا. سفید کپڑے خاکی ہو گئے.

خدا خدا کر کے یہ رقصِ وحشت تھما. وہ اُسی حالت میں مشاعرہ گاہ کی طرف چل دیے.

اُس کا یہ رُوپ بھی لوگوں کو بھا گیا. ایسا شاعر جسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں. اِسی لیے تو اُس کی شاعری میں اِتنا درد ہے. اہلِ مشاعرہ کی تمام ہمدردیاں اُس کے ساتھ ہو گئیں. جگر زندہ باد کے نعر ے لگنے لگے.

جگر کو سُننے کے لیے لوگ ایسے بے تاب تھے کہ کسی دوسر ے شاعر کو سُننا نہیں چاہتے تھے.

شاعر آتے رہے اور گھاس کی طرح کٹتے رہے. آخر جگر کی باری آ گئی.

آج جگر تھا بھی خوب رنگ پر.

.

کچھ اِس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے
جب تک ہمار ے پاس رہے، ہم نہیں رہے

ایمان و کفر اور نہ دنیا و دیں رہے
اے عشق شادباش! کہ تنہا ہمیں رہے

یارب کسی کے رازِ محبت کی خیر ہو!
دستِ جُنوں رہے نہ رہے، آستیں رہے

دردِ غمِ فراق کے یہ سخت مرحلے
حیراں ہوں میں کہ پھر بھی تم، اتنے حسیں رہے

جا اور کوئی ضبط کی دنیا تلاش کر
اے عشق! ہم تو اب تیرے قابل نہیں رہے

مجھ کو نہیں قبول دو عالم کی وسعتیں
قسمت میں کُوئے یار کی دو گز زمیں رہے

اللہ رے چشمِ یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

اِس عشق کی تلافیِ مافات دیکھنا
رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہے

.

جگر کی آواز آسمان میں جگہ بنا رہی تھی. مولوی صاحب کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی. جادو نے اپنا کام کر دکھایا.

مولوی صاحب کچھ دیر تو بے چینی سے ٹہلتے رہے، پھر گھر سے باہر آ گئے. سوز میں ڈوبی ہوئی آواز نے اُن کے دل کو کھینچ لیا. اُنہوں نے قدم بڑھائے اور اِس طرح مشاعرے کی طرف چل دیے، جیسے کوئی اسلام قبول کرنے آتا ہے.

مشاعرے میں پہنچ کر سیدھا اسٹیج کی طرف بڑھے اور جگر کے بالکل برابر بیٹھ کر جُھومنے لگے. جگر ایک ایک کر کے غزلیں پڑھتا جا رہا تھا اور مجمع پر وجد کا عالم طاری تھا.

جب جگر اپنا کلام سُنا چکا تو اُس کی نظر مولوی صاحب پر پڑی.

"حضرت شراب حرام ہے، سب جانتے ہیں لیکن جہاں تک آپ کی خاص ذات کا تعلق ہے، شاید یہ آپ کے لیے حلال کر دی گئی ہو." مولوی صاحب نے کہا.

جگر نے مُسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور جیب سے بوتل نکال کر اُنہیں پیش کی.

"بسم اللہ."

"حضور میرا ظرف اِس قابل نہیں کہ اِسے ہاتھ بھی لگا سکوں." مولوی صاحب نے کہا.

پھر سب نے دیکھا کہ جگر اُن کے سامنے بیٹھ کر پی رہا ہے اور مولوی صاحب اُٹھ کر نہیں گئے.

"جب مولوی صاحب نے مجھ پر اتنا کرم کیا ہے تو ایک غزل میں خاص اُن کے لیے پیش کرتا ہوں."

مشاعرہ ختم ہو چکا تھا لیکن جگر کے اِس اعلان کے بعد جو جہاں تھا، وہیں بیٹھ گیا. جگر نے غزل پیش کی.

.

کثرت میں بھی وحدت کا تماشا نظر آیا
جس رنگ میں دیکھا تجھے، یکتا نظر آیا

جب اُس رُخ پر نور کا جلوہ نظر آیا
کعبہ نظر آیا نہ کلیسا نظر آیا

یہ حُسن، یہ شوخی، یہ کرشمہ، یہ ادائیں
دنیا نظر آئی مجھے، تُو کیا نظر آیا!!

اِک سر خوشیِ عشق ہے، اِک بے خودیِ شوق
آنکھوں کو خدا جانے مری کیا نظر آیا

قربان تری شانِ عنایت کے دل و جاں
جب آنکھ کُھلی، قطرہ بھی دریا نظر آیا

جب دیکھ نہ سکتے تھے تو دریا بھی تھا قطرہ
اِس کم نگہی پر مجھے کیا کیا نظر آیا

ہر رنگ تر ے رنگ میں ڈوبا ہوا نکلا
ہر نقش ترا نقشِ کفِ پا نظر آیا

آنکھوں نے دکھا دی جو ترے غم کی حقیقت
عالم مجھے سارا تہہ و بالا نظر آیا

ہر جلوے کو دیکھا ترے جلووں سے منوّر
ہر بزم میں تُو انجمن آرا نظر آیا
.
مولوی صاحب نے ایک رند سے تصوّف میں ڈوبی ہوئی غزل سُنی تو چودہ طبق روشن ہو گئے. علمِ مکتبی دھرے کا دھرا رہ گیا. جگر اُنہیں نیم بسمل چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا.

کسی مشاعر ے میں اُس کی مُلاقات جگن موہن لال رواں سے ہو گئی. رواں کو جگر سے ایسی عقیدت ہوئی کہ وہ اُسے اپنے ساتھ اناؤ لے آئے.
جگر کی زندگی اُس وقت اِس طرح گزر رہی تھی، جس کے ہاتھ لگ جاتا وہ اُسے پکڑ کر لے جاتا. یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ جگر جیسے شاعر سے اُس کے اِتنے قریبی تعلقات ہیں. پھر یا تو اُس کا دل بھر جاتا یا خود جگر رسی تڑوا کر کہیں نکل جاتا.
رواں اُسے لے کر اپنے وطن اناؤ آئے اور اپنے پاس ٹھہرایا. اُسی دن اُس کے چشموں کا بکس کہیں پھینکوا دیا.
"اب آپ جیسے شاعر کو یہ کام زیب نہیں دیتا."
"پھر ہماری شراب کا کیا ہوگا؟"
"اُس کا ذمّہ میں لیتا ہوں. آپ کو شراب ملتی رہے گی."
"نہیں جناب، یہ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہے. آپ کب تک مجھے پلاتے رہیں گے اور میں کب تک آپ سے مانگتا رہوں گا! نہیں جناب نہیں، میری غیرت یہ گوارا نہیں کر ے گی."

اُس کی یہ بات رواں کے دل کو لگی. اُنہوں نے کوشش کر کے ڈسٹرک گزٹ کی ایڈیٹری اُس کے سپرد کر دی لیکن دفتر جانے کی پابندی نہیں تھی. یہاں سے سو روپے ملنے لگے.
دن رات شہر بھر کے شعرا اُس کے گرد جمع رہنے لگے. بعض شاعر تو کئی کئی دن تک اُس کے پاس سے اُٹھ کر جانے کا نام نہیں لیتے تھے. اُن شاعروں کے گھر والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ جس شاعر کی محبّت میں اُنہیں دن رات کا ہوش نہیں رہا، وہ واقعی کوئی شاعر ہے یا کوئی طوائف ہے جسے اِن لوگوں نے کسی گھر میں چُھپا کر رکھا ہوا ہے. بعض گھروں میں تو جھگڑ ے اِتنے بڑھے کہ جگر کو باقائدہ وہاں لے جا کر رُونمائی کرائی گئی کہ دیکھ لو! یہ ہے وہ ذاتِ شریف جس کے عشق میں پورا اناؤ پاگل ہو گیا ہے.
سب اُس کے عشق میں مُبتلا تھے اور وہ! وہ سُندری اور مُندری پر مر مِٹا تھا.
یہ دو حسین و جمیل پریاں، نور کی شکلیں، آپس میں بہنیں تھیں. کسی ہندو ریاست کے مہاراجہ کی ملازمہ تھیں اور شہر سے باہر ایک کوٹھی میں رہتی تھیں. ہر ایسے ویسے کی تو ہمّت بھی نہیں تھی کہ وہاں جاتا. جگر نے اُنہیں کسی محفل میں دیکھ لیا اور پھر بے کھٹک وہاں پہنچ گیا. اُس کی شہرت اب اِتنی تو ہو گئی تھی کہ وہ اُسے پہچان بھی سکیں اور قدر بھی کر سکیں. اور پھر اچھی غزلوں کی تلاش طوائفوں کو ہمیشہ رہتی ہے، اُنہیں بھی تھی. جگر اُن سے خوش ہو تو نئی سے نئی غزل اُنہیں مل سکتی ہے. یہی سوچ کر اُنہوں نے جگر کو آنکھوں سے بُلایا اور پلکوں پہ بٹھایا.
اناؤ میں رہنے کے لیے کوئی سہارا تو چاہئیے تھا. جگر نے یہ در دیکھ لیا. لیکن کبھی کبھی وہاں جاتا تھا. کوشش کرتا تھا کہ ہوش میں جائے لیکن عالمِ مدہوشی میں بھی پہنچ ہی جاتا تھا. پینے کے معاملے میں بے اعتدال تھا اِس لیے وہ دونوں بہنیں اُس سے پریشان رہنے لگیں. عزت کرتی تھیں لیکن ذلیل کبھی نہیں کیا.
اُن کی بے زاری جگر کی نظروں سے چُھپی نہیں رہ سکی. ایک دن یہ کہہ کر وہ وہاں سے اُٹھ گیا.
.
رہ گئیں پردۂ ظاہر میں اُلجھ کر نظریں
حُسن دیکھا نہ کسی نے مری رُسوائی کا
.
"جگر صاحب سُنئیے تو. یہ مطلب نہیں تھا. آپ تو بُرا مان گئے." سُندری اُسے روکنے کے لیے درواز ے تک آئی مگر وہ چلا گیا.
اناؤ کے ایک ایک گھر میں اُس کی مے نوشی کی شہرت ہو گئی تھی. بیویاں اپنے شوہروں کو روکتی تھیں. خبردار! اُس شاعر کے پاس مت بیٹھنا. ایک دن رواں کی والدہ نے اُن سے پوچھا. "یہ تُو نے کس مولوی کو اپنے پاس ٹھہرا لیا ہے! سُنا ہے شراب پیتا ہے. ایسے ہی مولویوں نے تو سب کو بدنام کیا ہے. تُو اُس سے بچ کر رہا کر. مسلمان بھی ہے اور شرابی بھی." رواں ہنس کے چُپ ہو گئے، کیا کہتے.
جس طرح جگن لال موہن رواں اُسے ایک مشاعر ے سے پکڑ لائے تھے، اِسی طرح ایک مشاعر ے میں وہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا. وہ ہاتھ ملتے رہ گئے. معلوم ہوا جگر مین پور میں دیکھا گیا ہے.
.
جگر کے اناؤ سے جانے کے بعد سُندری اور مُندری بھی چلی گئیں. وہ کوٹھی ویران ہو گئی جو کبھی سُندری کی آواز اور جگر کی غزلوں سے گُونجتی تھی.

مین پور میں آنریری مجسٹریٹ اصغر حسین اُس کے کفیل تھے. اُنہوں نے یہ سوچ کر کہ اُس کی دل بستگی کے لیے کوئی سامان ہونا چاہئیے، اُسے ایک طوائف شیرازن سے ملوا دیا. یہ ڈیرادارانی تھی اور ایک ہندو سیٹھ لالہ دھرم داس کی ملازمہ تھی یعنی کسی اور سے تعلق نہیں رکھ سکتی تھی. کوئی خاص مہمان آتا بھی تو دن کے وقت. اصغر حسین نے شیرازن سے سفارش کی کہ بے چار ے شاعر ہیں اور پریشان حال ہیں. تم کہو تو وقت گزاری کے لیے تمہار ے پاس آ جایا کریں گے. اصغر حسین نے اِس مہربانی کے سلسلہ میں کچھ رقم بھی اُس کے ہاتھ پر رکھ دی.

جگر نے اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا. اُس محویت میں اُس کی حُسن پرستی کو تو دخل تھا ہی لیکن دوسری بات یہ کہ اُس کی صورت جگر کی پہلی بیوی سے بہت مشابہت رکھتی تھی.

وہاں سے لوٹا تو یہ حال تھا.

.

ہُجومِ تجلّی سے معمور ہو کر
نظر رہ گئی شعلہِ طُور ہو کر

.

اصغر حسین کچہری نکل جاتے اور وہ اکیلا رہتا تو کبھی کبھی شیرازن کے گھر جا نکلتا. اُس کے انداز اوباش تماش بینوں جیسے نہیں تھے. اُس کی یہی ادا شیرازن کے دل میں اُتر گئی.

کسی عقیدت مند کی طرح وہ اُس کے گھر جاتا، غزلیں سُناتا یا وہ اُس کی غزلوں کو ساز و آواز کا رُوپ دیتی.

.

طوائف ہونے کے باوجود اُسے شراب کی بُو سے نفرت تھی. جگر کو اِس کا علم تھا لہذا کوشش کرتا تھا کہ اُس کے سامنے شراب پی کر نہ جائے. بس یہی پابندی جگر کو کُھل گئی اور اُس نے وہاں جانا ترک کر دیا.

جادو اپنا کام کر چکا تھا. اب وہ نہیں، شیرازن اُس سے ملنے کے لیے بے تاب تھی. حُسن خود عشق کی تلاش میں نکلا. تقاضے آنے لگے. وہ خود چل کر آئی.

"جگر تم نے آنا کیوں چھوڑ دیا؟ تم پی کر آؤ. میر ے سامنے بیٹھ کر پیتے رہو. مجھ کو یہ اعتراض نہیں ہوگا. تم آؤ تو!"

اُس نے مروّت کی چھڑی اُٹھائی اور شیرازن کا سہارا لے کر پھر اُس کے گھر پہنچ گیا. وہ پہنچ تو گیا لیکن مؤدب ہو کر بیٹھ گیا. آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمّت نہیں تھی.

"خدا کے واسطے جگر، کچھ بولو. میرا تو دم گُھٹا جاتا ہے. خدا کے لیے کوئی بات کرو."

.

نظروں کے سامنے اب منزل ہیں نہ راہیں
جلووں نے تیر ے مل کر سب لُوٹ لیں نگاہیں

.

"دیکھو میں تمہار ے لیے کیا لائی ہوں."

شیرازن دوسر ے کمر ے میں گئی. واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی جو اُس نے جگر کے سامنے رکھ دی.

"تم نے اِس لیے آنا چھوڑا تھا ناں. آج میں تم کو اپنے ہاتھوں سے پلاؤں گی."

"سرکار کو تکلیف ہوگی." جگر نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا.

"ایں! میں سرکار کب سے ہوگئی؟" اُس نے ہنستے ہوئے کہا.
"تم حُسن کی سرکار ہی تو ہو. اور تمہارا یہ گھر میرے لیے طُور ہے. تمہیں کیا خبر، یہاں آ کر میں کیا کیا دیکھتا ہوں."
اُس دن کے بعد سے وہ شیرازن کو ہمیشہ سرکار کے خطاب سے نوازتا رہا اور اُس کے گھر کو طُور کہتا رہا.
"اللہ! پیجئے ناں."
"سرکار کو تکلیف ہوگی."
"آپ کو میری قسم."
"تم نے بہت قیمتی شراب منگوالی. میں تو سستی پیتا ہوں تاکہ احباب زیرِ بار نہ ہوں."
"پیجئے ناں."
وہ ساغر، پیالے، جام کا تو قائل ہی نہیں تھا. اِذنِ یار کی شہ پا کے بوتل سے منہ لگا لیا.

.

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا، لہرا کے پی گیا

بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑ تاڑ کے، تھرّا کے پی گیا

زاہد! یہ میری شوخیِ رندانہ دیکھنا!
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

سر مستیِ ازل مجھے جب یاد آ گئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا

آزردگیِ‌خاطرِ ساقی کو دیکھ کر
مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا

ا ے رحمتِ تمام! مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

پیتا بغیر اِذن! یہ کب تھی مری مجال!
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

اُس جانِ مے کدہ کی قسم! بارہا جگر
کُل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

.

پی وہ رہا تھا، نشہ شیرازن کو ہو رہا تھا. اُس کا محبوب جگر اُس سے خوش ہو گیا تھا. یہی تو نشہ تھا.

پچھلی مرتبہ تم جو غزل مرحمت فرما گئے تھے، ہم نے ابھی لالہ دھرم داس کو بھی نہیں سُنائی کہ تم کو سُنا لیں تو پھر کہیں اور گائیں گے.
سارند ے آ گئے. شیرازن کی آواز نے طُور کو شعلہِ طُور بتانا شروع کر دیا.
.
دل میں تم ہو، نزع کا ہنگام ہے
کچھ سحر کا وقت ہے، کچھ شام ہے

عشق ہی خود عشق کا انعام ہے
واہ کیا آغاز! کیا انجام ہے

حُسن ہے، نغمہ ہے، مے ہے، جام ہے
اب کہاں ا ے گردشِ ایّام ہے؟؟

پینے والے ایک یا دو ہوں تو ہوں
مُفت سارا مے کدہ بدنام ہے

پی رہا ہوں آنکھوں آنکھوں میں شراب
اب نہ شیشہ ہے نہ کوئی جام ہے

ہوشیار! او کامیابِ زندگی
زندگی ناکامیوں کا نام ہے

کیا جگر سے آپ بھی واقف نہیں؟؟
ایک ہی تو رندِ مے آشام ہے
.
وہ بجلیاں گرا چلی تو جگر نشیمن کے تنکوں کی طرح بکھر گیا.
مدہوشی ایسی طاری ہوئی کہ وہ اپنا ہوش کھو بیٹھا. شیرازن نے اُسے کسی نہ کسی طرح مسہری پر لِٹایا اور پنکھا جھلنے لگی.
اُسے ہوش آیا تو شیرازن اُس کے پاؤں داب رہی تھی. اُس نے گھبرا کر پاؤں سمیٹ لیے.
"محبوبہ کو خدمت گار کے رُوپ میں دیکھوں، یہ بھی دیکھنا تھا؟؟ اِسی لیے یہ کمبخت شراب بُری چیز ہے. مجھے معاف کر دو. سرکار کو تکلیف ہوئی. مجھے معاف کر دو."
"جگر صاحب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی. تمہاری خدمت سے مجھے خوشی ہوتی ہے."
وہ روتا رہا، معافی مانگتا رہا. جب طبیعت کچھ سنبھلی تو بادل نخواستہ وہاں سے اُٹھ آیا. آج وہ شدید مضطرب تھا. اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ شیرازن سے محبّت کرنے لگا ہے. یہ محبّت ہی تو ہے جو

اُس کی طرف آنکھ نہیں اُٹھانے دیتی۔ وہ جب بھی وہاں گیا اُس کی جھلک ہی دیکھی تھی، اُسے جی بھر کے دیکھا تک نہیں تھا۔

.

تجھ کو دیکھا مگر اِس طرح کہ دیکھا ہی نہیں
اپنی کم مائیگیِ جرات و ہمّت کی قسم!

نگہِ حُسن ہی سے حُسن کو ہم دیکھتے ہیں
مذہبِ عشق کی پاکیزہ شریعت کی قسم!

مجھ سے چُھپنا تجھے زیبا نہیں ا ے پیکرِ حُسن
میں محبّت ہی محبّت ہوں محبّت کی قسم!

.

اُسے اُس شراب کے ہاتھوں شیرازن کے سامنے ذلیل ہونا پڑا۔ محبوبہ کو خدمت گار کے رُوپ میں دیکھ کر اُسے سخت اذیّت پہنچی تھی۔ اُس نے شراب ترک کرنے کا اعلان کر دیا۔ دوستوں کو خطوط لکھ دیے۔ احباب سے صاف کہہ دیا کہ کوئی اُس کے سامنے شراب کا نام تک نہ لے!
اُس نے اپنی توبہ کو قائم رکھنے کے لیے نماز بھی شروع کر دی۔ ایک دن وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ کوئی دوست ملنے آ گیا۔ وہ نماز سے فارغ ہوا تو آنے والا حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"جگر صاحب! آپ اور نماز؟؟"
"بھائی یہ تو اتنی اچھی چیز ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سب کو پڑھنی چاہئیے۔"
سوال کرنے والے کو پھر اتنی جرات نہیں ہوئی کہ کوئی اور سوال کرتا۔ بات تو یہی ہے جو جگر نے کہی۔

.

علّامہ تاجور نجیب آبادی نے لاہور میں اُردو مرکز قائم کیا۔ کارکنانِ مرکز کی فہرست میں یاس یگانہ چنگیزی اور جگر بھی تھے۔ اب اُس کا ستارۂ قسمت شہرت کی طرف مائل بہ پرواز تھا۔
اُسے شیرازن کا فراق قطعی گوارا نہیں تھا لیکن جب خود شیرازن نے اصرار کیا کہ وہ اِس اعزاز کو نظر انداز نہ کر ے تو وہ تیّار ہو گیا۔
ایک زمانہ وہ تھا کہ جب وہ چشموں کی تجارت کے سلسلہ میں یہاں آیا تھا اور کچھ دن قیام کیا تھا۔ اُس وقت اُسے کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ لاہور جیسے ادبی مرکز میں وہ اجنبیوں کی طرح آ کر چلا گیا تھا۔ اور ایک وقت یہ آیا کہ وہ اُردو مرکز کی دعوت پر مہمان کی حیثیت سے لاہور پہنچا۔
اُتّر پردیش سے دو شاعر آئیں اور لاہور میں مشاعرہ نہ ہو؟؟ انجمنِ اربابِ علم نے مشاعرہ کروایا۔ ہندوستان بھر کے شعرا موجود ہیں۔ خود یاس یگانہ چنگیزی کیا کم ہیں!! جگر کا نام نیا نیا اُبھرنا شروع ہوا تھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ مین پور سے لاہور تک کا سفر طے کر کے اُس کی شہرت نے اُسے یہاں پہنچا دیا تھا۔ سب کی نگاہیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اُٹھا اور مشاعر ے پر چھا گیا۔ اُس نے غزل پڑھنا شروع کی۔

.

تر ے جلووں میں گم ہو کر، خودی سے بے خبر ہو کر
تمنّا ہے کہ رہ جاؤں سر تا پا نظر ہو کر

نہ چونکے اہلِ دل تا حشر مست و بے خبر ہو کر
زمانہ کروٹیں بدلا کِیا، شام و سحر ہو کر

یہاں تک جذب کر لوں کاش تیر ے حُسنِ کامل کو
تجھی کو سب پُکار اُٹھیں، گزر جاؤں جدھر ہو کر

حریمِ حُسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر
جو بیٹھو با ادب ہو کر، تو اُٹھو با خبر ہو کر
.
مشاعر ے کے بعد لوگوں نے اُسے اِس طرح گھیر لیا جیسے چاہنے والے فلمی اداکار کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں.
دوسر ے مشاعر ے میں اُس نے یہ غزل پڑھی.
.
جدھر سے حُسن کا اک گوشۂ نقاب اُٹھا
تمام ذرّ ے پُکار ے، وہ آفتاب اُٹھا!

کہیں نہ فتنہ کوئی اُٹھ کے تھام لے دامن
قدم نہ راہِ محبّت میں بے حساب اُٹھا

اُٹھا چکا ہے بہت نازِ بادہ و ساغر
شکستِ نشہ سے اب لذّتِ شراب اُٹھا

جدھر کو مستیِ دریا نے رُخ کِیا اپنا
تڑپ کے موج اُٹھی، جُھوم کے حباب اُٹھا

مجھ کو اُٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں
جو اُٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اُٹھا

قریبِ ساعتِ وصل آ چکی ہے اب تو جگر
نچوڑ دامنِ تر، دیدۂ پُر آب اُٹھا
.
اِس کے بعد لاہور میں اُس کی دُھوم مچ گئی. اہلِ پنجاب اور اُتّر پردیش کے شعرا میں شاعرانہ چشکمیں چلتی رہتی تھیں. دونوں ایک دوسر ے کو ماننے کو تیّار نہیں تھے. لیکن اُسے جس طرح پزیرائی ملی، وہ اُس کی شاعری کے ساتھ ساتھ اُس کے کردار کی عظمت کا بھی انعام تھی. وہ بے نیاز نہ تو اُتّر پردیش کی عظمت کے ترانے پڑھتا ہوا آیا نہ اہلِ پنجاب کی تضحیک میں فقر ے ادا

کرتا ہوئے واپس گیا. وہ سر سے پا تک شاعر تھا، اِس کے سوا کچھ نہیں. اِسی کا صلہ تھا جو اُسے ہر جگہ مل رہا تھا.
اُردو مرکز زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکا اور اُسے لاہور سے واپس آنا پڑا.

.

لاہور سے نکلنے کے بعد اُس پر پھر دیوانگی کا دورہ پڑا. یونہی بے مقصد گُھومتا رہا. کبھی دہلی میں نظر آتا تو کبھی لکھنؤ کی سڑکوں پر کسی کو مل جاتا. کبھی لوگ اُسے ڈھونڈتے پھرتے اور وہ کسی کو بھی نہ ملتا. اک عالمِ جُنوں تھا جس کی سیاحت کو وہ نکلا تھا.

.

پھر عشقِ جُنوں پیشہ یوں سلسلہِ جنباں ہے
راہیں بھی گریزاں ہیں، منزل بھی گریزاں ہے

.

شاید وہ شیرازن کی یادوں سے دامن بچاتا پھر رہا تھا. لیکن دنیا اِتنی چھوٹی ہے کہ بھاگ کر کہاں جاتا.

.

یہ کس نے منتشر کر دیں جُنوں سامانیاں میری
زمیں سے آسماں تک ایک میں ہوں یا فغاں میری

.

وہ اچانک مین پور کے مشاعر ے میں نمودار ہوا. وہ بھی اِس حالت میں کہ آنکھیں چڑھی ہوئیں، ہونٹ تر، قدم بہکے ہوئے، گریباں چاک، شرابِ مجسّم.
توبہ کہیں رستے میں رہ گئی تھی.
اصغر حسین ایڈووکیٹ اسٹیج پر بیٹھے تھے. وہ اُن کے قریب ہی بیٹھ گیا.
"جگر، یہ کیا حالت بنا لی ہے؟"
"سرکار کے بغیر جیا نہیں جاتا."
"تو اُس نے کون سی پابندی لگا دی تھی! چلے آتے."
"آ تو گیا ہوں."
"مگر کس حال میں."
"سرکار کے شہر میں آنے کے لیے شراب کے بغیر ہمّت کہاں سے لاتا."
یہ شہر اُس کے لیے نیا نہیں تھا. یہاں کے لوگوں نے اُس کے جُنونِ محشر بدوش کے بہت سے تماشے دیکھے تھے. شیرازن اور اُس کی محبّت کے چرچے بھی ہر زبان پر تھے. اُس کی شاعری کے قدردان بھی بہت تھے اور پھر آج تو اُس کا عالم ہی کچھ اور تھا. اِس کا اندازہ اُس وقت ہوا جب اُس نے دنیائے ادب میں اِس غزل کا اضافہ کیا.

.

فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادہِ منزل مجھے
جا رہا ہوں، جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے

اب کدھر جاؤں بتا ا ے جذبہِ کامل مجھے
ہر طرف سے آتی ہے صدائے دل مجھے

روک سکتی ہو تو بڑھ کے روک لے منزل مجھے
لے اُڑی ہے ایک موجِ بے قرارِ دل مجھے

کیسا قطرہ؟ کیسا دریا؟ کس کا طوفاں؟ کیسی موج؟
تُو جو چاہے تو ڈبو د ے خشکیِ ساحل مجھے

یہ بھی کیا منظر ہے بڑھتے ہیں نہ ہٹتے ہیں قدم
تک رہا ہوں دور سے منزل کو میں، منزل مجھے
.
یہ غزل اُس کی حالتِ زار کی ایسی ترجمان تھی کہ جس نے سُنی، اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ کس حال میں ہے، کیا سوچ رہا ہے. اُس کے پاؤں کے چھالے، اُس کے سینے کے داغ ہر ہاتھ نے محسوس کیے، ہر آنکھ نے دیکھ لیے.

اُردو میں خمریات کا ذخیرہ نایاب نہیں. ہزاروں شعر شراب کو موضوع بنا کے لکھے گئے ہوں گے. خود اُس کے دور میں ریاض خیر آبادی اِس موضوع کو جانِ شاعری بنائے ہوئے تھے لیکن اُس نے یہ نغمۂِ سرمستی اِس مہارت سے چھیڑا کہ اِس کی دوسری مثال اُردو تو کیا فارسی میں بھی نظر نہیں آتی. جگر کا حق بھی تھا کہ یہ شاہکار جگر سے منسوب ہو.
اُس کے اشعار دیکھتے ہی دیکھتے بچے بچے کی زبان پر آ گئے. وہ ایک مصرع پڑھتا تو مجمع دوسرا مصرع پڑھ دیتا.
.
اب کو جو وہ مین پور میں آیا تو حد درجہ مضطرب تھا. پیتا پہلے بھی تھا لیکن اب کے عالم ہی دوسرا تھا. شیرازن اُسی شہر میں موجود تھی لیکن ابھی تک وہ اُس سے ملنے نہیں گیا تھا. اُس کی حکم عدولی ہوئی تھی. اُس نے توبہ توڑ دی تھی. اب وہ کیا منہ لے کر اُس کے پاس جاتا! اُس نے شراب ترک کر دی تھی. پھر کیا ہوا؟ کیوں ٹوٹ گئی توبہ!
اُس نے شکستِ توبہ کا جواز پیش کیا اور اِس انداز سے کہ شکست کو فتح اور فتح کو تخلیق بنا دیا.
.
ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا، لہرا کے پی گیا

بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑ تاڑ کے، تھرّا کے پی گیا

زاہد! یہ میری شوخیِ رندانہ دیکھنا!
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

سر مستیِ ازل مجھے جب یاد آ گئی

دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا

آزردگیِ‌خاطرِ ساقی کو دیکھ کر
مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا

اے رحمتِ تمام! مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

پیتا بغیر اِذن! یہ کب تھی مری مجال!
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

اُس جانِ مے کدہ کی قسم! بارہا جگر
کُل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا
.
ایک دن وہ مدہوش تھا اور ضد کر رہا تھا کہ شیرازن کے پاس جائے گا. احباب اُسے شیرازن کے پاس لے کر پہنچے. گھر کے قریب پہنچے تو دیوانے کو ہوش آ گیا.
"سرکار کو تکلیف ہوگی."
احباب اُس کی ضد پر اُسے واپس لے آئے. آتے ہی پھر وہاں جانے کی ضد شروع کر دی.
اضطرابی کیفیت کا ایسا غلبہ ہوا کہ احباب پھر مجبور ہو گئے. اُسے پھر تانگے پر لادا گیا. سہارا د ے کر اُسے اُتارا گیا. ہاتھ بھر کے فاصلے پر شیرازن کا دروازہ تھا.
"سرکار کو تکلیف ہوگی. میں اِس قابل نہیں. مجھے واپس لے چلو."
شیرازن کو اطلاع ہوئی. وہ گھبرا کے درواز ے پر آ گئی.
.
ہجومِ تجلّی سے معمور ہو کر
نظر رہ گئی شعلہِ طُور ہو کر

جگر کی اداؤں کا اب پوچھنا کیا
تری مست نظروں سے مخمور ہو کر
.
جگر گردن جُھکائے کھڑا تھا جیسے مجرم رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو. شیرازن نے اُس کا ہاتھ تھام لیا.
"جگر، میں بھی یہاں، تم بھی یہاں، پھر یہ اضطراب کیسا؟"
جگر کی خاموشی اُسے ہولائے د ے رہی تھی. وہ خوشامد کر رہی تھی اور وہ خدا جانے کس عالم میں خاموش بیٹھا تھا. بار بار پہلو بدلتا تھا. جیسے بھاگنے کی فکر ہو.
یہ عالم کبھی کبھی کا نہیں تھا. ہمیشہ یہی ہوتا تھا. مضطرب ہو کر اُس کے در پر پہنچتا پھر یا تو لوٹ آتا یا ایسے مؤدب ہو کر بیٹھتا جیسے پیر کے سامنے مرید.

حقیقی محبّت کی بہت ساری کہانیاں زمانے نے سُنی ہوں گی. جگر بھی ایک کہانی مرتّب کر رہا تھا.
وہ شیرازن کے گھر کو طُور کہتا تھا اور شیرازن کو شعلہِ طُور. شعلہِ طُور نے اُسے جلا کر کُندن بنا دیا.
وہ شیرازن کے سامنے زبان تو نہیں کھول سکتا تھا لیکن ایک طوفان اُس کے اندر کروٹیں بدل رہا تھا جس کا اظہار آخر اُس کی شاعری میں ہو کر رہا.

.

شیرازن سے مُلاقات کے بعد اُس کی شاعری کا ایک دور ختم ہوا اور دوسرے دور کا آغاز ہوا. جو نہایت جذباتی، نہایت ہنگامہ خیز اور نہایت سرمست تھا. وہ ایک دریا تھا جو اپنی دُھن میں مست تھا. ایک شعلہِ بے تاب تھا جو خرمنِ سماعت میں آگ لگا دیتا تھا. تمام زخموں کے ٹانکے ایک ساتھ کُھل گئے. اُسے شیرازن سے نہیں، عشق سے عشق ہو گیا تھا. اور جب حضرتِ اصغر کی تربیت کے طفیل اُس عشق میں تصوّف کی چاشنی گُھل جاتی تھی تو یہ سرمدی نغمے زمین و آسمان ہلا دیتے تھے.

.

جدید اُردو غزل کے اُس وقت تین بڑے سُتون تھے. فانی بدایونی، اصغر گونڈوی اور حسرت موہانی. فانی بدایونی کے نغموں میں غم کی لَے اتنی تیز تھی کہ دل بُجھ جاتے تھے. اصغر گونڈوی کا تصوّف خواجہ میر درد کی بازگشت تو تھا لیکن چند لوگ ہی فیض یاب ہو سکتے تھے. حسرت موہانی کا عشق عام سطح سے بہ مشکل اوپر اُٹھتا تھا. ایک آواز کے لیے جگہ بلکل خالی تھی. اور وہ تھی جراتِ رندانہ کی آواز. بے نیازی، بے فکری، بے قراری کی آواز. پہاڑوں سے گرتے ہوئے آبشار کی آواز. موسیقیّت سے بھرپور، نشے سے مخمور آواز. اُردو شاعری کو اب تک کوئی حافظ شیرازی میسّر نہیں آیا تھا. شیرازن نے اُسے اُردو شاعری کا حافظ شیرازی بنا دیا.

.

میں نہیں بسملِ خیّام جگر
حافظِ خوش کلام نے مارا

.

صاف نظر آتا تھا کہ اُردو غزل کی عمارت کا چوتھا سُتون بننے والا ہے. اِس تعمیر میں شیرازن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا.

.

کثرتِ شراب نوشی اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی. 1928 میں وہ شدید بیمار پڑا. کئی بیماریوں نے ایک ساتھ زور باندھا لیکن سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ وہ قلب میں تکلیف محسوس کر رہا تھا.
شیرازن اُس کی خیریت معلوم کرنے آئی. سخت افسردہ تھی.
"کیسے ہو."
"بہتر ہوں."
"تم شاعر نہیں معلوم ہوتے." اُس نے جُھنجلا کر کہا. "کیا کوئی محبّت کرنے والا جبکہ وہ شاعر بھی ہو، یہ پسند کر سکتا ہے کہ اُس کا محبوب اپنی شکست کا اعلان کر دے؟"
وہ پھر بھی خاموش رہا تو شیرازن نے اپنی شکست کا اعلان کر دیا.

"میں کُھلے دل سے پیشکش کرتی ہوں کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔"
"نہیں سرکار نہیں! میرا تم سے فراق کا رشتہ ہے۔"
"آتے تو رہو گے؟"
"ٹھیک ہو جاؤں تو۔"
اِس علالت کے دوران اُسے اصغر کی یاد آ گئی۔ بیماری کا کیا بھروسہ۔ مرشد کے پاس تو ہو آؤں۔ ابھی شفایاب نہیں ہوا تھا۔ بس ذرا طبیعت سنبھلی تھی کہ وہ اصغر کے پاس پہنچ گیا۔ اصغر کے سامنے وہ یوں بھی کوشش کرتا تھا کہ پی کر نہ جائے اور اب تو وہ بیمار تھا۔
"تمہاری غزل لہرا کے پی گیا، بل کھا کے پی گیا مجھ تک پہنچی۔ یہ اپنی نوعیت کی بے مثال غزل ہے۔ میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔"
"میں نے اقرارِ گناہ کِیا ہے۔"
"گناہ اور اِتنے روشن! جگر تمہاری توبہ قبول نہیں ہوئی لیکن شکستِ توبہ ضرور معاف ہو گئی ہوگی۔ اللہ غفور الرحیم ہے۔"
جگر آبدیدہ ہو گیا۔ "آپ دعا کیوں نہیں کرتے کہ مجھے اِس بلا سے نجات مل جائے۔"
"اِس کا بھی وقت آئے گا۔ ابھی کچھ سفر باقی ہے۔ تھکے ہوئے ہو گے، آرام کر لو۔"
رات کا وقت تھا۔ گھر کے ایک کمر ے میں اُس کا بستر لگا دیا گیا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد اُسے نسیم کا خیال آ گیا۔ اُسی گھر میں وہ بھی موجود تھی۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس کی نیند چٹ ہو گئی۔ کروٹ پہ کروٹ بدل رہا تھا لیکن نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔ پھر اچانک اُس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اُس کے سینے میں درد اُٹھا تھا۔ وہ ہلکے ہلکے کراہ رہا تھا۔ اِس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں اصغر یا نسیم نہ سُن لیں۔ خوامخواہ اُنہیں زحمت ہوگی۔
دوسر ے کمر ے میں نسیم اور اصغر کا بستر لگا ہوا تھا۔ نسیم بھی کروٹ پہ کروٹ بدل رہی تھی۔ اصغر بہت دیر سے اُس کی یہ حالت دیکھ رہے تھے۔ آخر اُن سے رہا نہیں گیا۔
"جاگ رہی ہو؟"
"ہاں۔"
"کیوں؟"
"جگر بھی تو جاگ رہے ہیں۔ سُن نہیں رہے۔ اُن کی کراہوں کی آواز آ رہی ہے۔"
"اچھا ایک بات بتاؤ۔" اصغر نے پوچھا۔ "کیا مجھ سے زیادہ محبّت کرتی ہو یا جگر سے؟"
"جگر سے۔" نسیم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "اگر وہ شراب نہ پئیں تو اُن سے اچھے آدمی کا تصوّر نہیں کِیا جا سکتا۔"
"نسیم مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے سچ کہہ دیا۔ اب ایک بات غور سے سُنو۔"
"کہئیے۔"
"اگر میں جگر سے پہلے مر جاؤں اور جگر شراب چھوڑ د ے تو یہ میری وصیّت ہے کہ تم اُس سے شادی کر لینا۔"
اِس کے بعد اصغر کے پاس کچھ کہنے کو تھا نہ نسیم کے پاس۔ کمر ے میں سنّاٹا تھا۔ کبھی کبھی جگر کے کراہنے کی آواز نسیم کو بے کل کر دیتی تھی۔
اِس مرتبہ وہ یہاں سے رُخصت ہوا تو کسی نہ کسی طرح نسیم سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اِس حادثے کو اُس نے یوں قلم بند کِیا۔

.

نظروں نظروں میں سرگزشتِ فراق
دونوں جانب دہائیاں، توبہ

حُسن کی لہر پھر سے دوڑا کر
اُس کی معجز نمائیاں، توبہ

پھر وہی چشمِ مست و جام بدست
پھر وہی نغمہ زائیاں، توبہ

پھر وہی لب، وہی تبسّمِ ناز
پھر وہی کج ادائیاں، توبہ

پھر وہ اک بے خودی کے عالم میں
مل کے باہم جدائیاں، توبہ
.
وہ مین پور واپس آیا تو صحت یاب ہو چکا تھا لیکن ذہنی طور پر مُنتشر تھا.
نسیم سے شادی ہو نہیں سکتی تھی، شیرازن سے شادی عشق کی موت تھی. یہی عشق تو تھا جو اُس کی شاعری کو ساحری بنائے ہوئے تھا.
شیرازن کی ایک ایک ادا شاعری میں قلم بند کر رہا تھا. عشق نے اُسے وہ فخرِ قناعت دیا تھا کہ تختِ شاہی بھی اُسے ٹاٹ کا بوریا نظر آتا تھا.

وہ مین پور واپس آیا تو صحت یاب ہو چکا تھا لیکن ذہنی طور پر مُنتشر تھا.
نسیم سے شادی ہو نہیں سکتی تھی، شیرازن سے شادی عشق کی موت تھی. یہی عشق تو تھا جو اُس کی شاعری کو ساحری بنائے ہوئے تھا.
شیرازن کی ایک ایک ادا شاعری میں قلم بند کر رہا تھا. عشق نے اُسے وہ فخرِ قناعت دیا تھا کہ تختِ شاہی بھی اُسے ٹاٹ کا بوریا نظر آتا تھا.
.
نظر سے حُسنِ دو عالم گرا دیا تُو نے
نہ جانے کون سا عالم دِکھا دیا تُو نے

کمالِ حُسن کا عالم دِکھا دیا تُو نے
چراغ سامنے رکھ کر بُجھا دیا تُو نے

ہزار جانِ گرامی فدا بہ ایں نسبت
کہ میری ذات سے اپنا پتا دیا تُو نے

خوشا وہ دردِ محبّت، زہے وہ دل کہ جسے

ذرا سُکون ہوا، گُد گُدا دیا تُو نے

ہر ایک دل کو عطا کر کے مُدعائے حیات
جگر کو ایک دلِ بے مُدعا دیا تُو نے

.
اُس دور میں اُس نے اپنی زندگی کی بہترین غزلیں کہیں. اُن غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت وہ بے اختیاری ہے جو عشقِ صادق نے اُس کی فطرت کے خمیر میں گُوندھ دی تھی.
اب اُس کی شہرت عروج پر تھی. اتنی شہرت شاید نواب داغ دہلوی کے سوا کسی شاعر کو اپنی زندگی میں نہیں ملی ہوگی. وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُسے خود بھی احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اُس کا مدِ مقابل نہیں.

.
تیرا دیوانہِ غریب جگر
فخرِ ہندوستان ہے پیار ے

.
شہرت اور شہرت بھی عزت و احترام کے ساتھ. اُس کی رندی و آوارگی کے باوجود ہر چھوٹا بڑا جگر صاحب کہہ کر پُکارتا تھا. اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ وہ گنہگار تھا لیکن گناہ اُس کا مزاج نہیں بن سکا.
اُسے معلوم تھا، وہ کبھی ہوش میں نہیں رہتا.

.
ﷲ جگر اب تو ذرا ہوش میں آ جا
تنگ آ گئے احباب تری بے خبری سے

.
لیکن اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ شراب نے اُسے کتنا نقصان پہنچایا ہے.

.
ستمِ کامیاب نے مارا
کرمِ لاجواب نے مارا

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

.
شراب پینے کے باوجود ندامت کا احساس اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا.
اصغر کہتے تھے کہ "ابھی وقت نہیں آیا. سب ٹھیک ہو جائے گا" لیکن وہ در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پیتا رہا. اب شراب اُس کے لیے مسئلہ نہیں تھی. اُس کے لیے شراب خریدنا، اپنے ہاتھوں سے پلانا لوگ سعادت سمجھتے تھے. وہ عالمِ ہوش میں غزلیں لکھتا رہا، عالمِ مدہوشی میں سُناتا رہا.
نہ پیسوں کی کمی تھی نہ شراب کی لیکن پیسوں کو جیب میں رکھنا اُسے زندگی بھر نہ آیا. جسے ضرورت ہوتی، مشاعر ے سے ملنے والی رقم اُس کے حوالے کر کے آگے بڑھ جاتا. کبھی اُسے

مدہوش دیکھ کر لوگ اُس کی جیب صاف کر جاتے. بُھولنے کی عادت شروع ہی سے تھی. قیمتی سے قیمی چیز رکھ کر، کسی کو دے کر بُھول جاتا اور پھر بُھول کر بھی اُس کا ملال نہ کرتا.
1930 تک پہنچتے پہنچتے عارضہِ قلب نے مُستقل صورت اختیار کرلی. چند مُخلص احباب نے مُختلف طریقوں سے اُس کی شراب نوشی پر پابندی لگانا چاہی لیکن بقول اصغر ابھی وقت نہیں آیا تھا. نہ اُس کی موت کا نہ ترکِ شراب کا.

.

بھوپال کے نواب علی حسن طاہر اُس کے بڑ ے قدرداں تھے. لکھنؤ میں اُن کی کوٹھی بھوپال ہاؤس کے نام سے مشہور تھی. اُنہوں نے کئی مرتبہ اُس سے کہا کہ وہ بھوپال ہاؤس مُستقر بنا لے لیکن جگر اِس نوازش کو اپنی ہتک ہی سمجھتا رہا لیکن ایک مرتبہ شیرازن سے ایسا بدگمان ہوا کہ لکھنؤ چلا آیا.

.

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزر ے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی! کہاں گزر ے؟؟

خطا معاف زمانے سے بدگماں ہو کر
تیری وفا پہ بھی ہمیں کیا کیا گماں گزر ے

.

نواب صاحب کو موقع مل گیا. اُنہوں نے جگر پر پابندی لگا دی کہ وہ بھوپال ہاؤس سے باہر نہیں جائے گا. پابندی اِس لیے تھی کہ وہ یہاں سے نکل کر کسی میخانے کا رُخ نہ کر لے.
اُنہیں یہ دیکھ کر تعجّب ہوا کہ جگر بڑی پابندی سے اُس پابندی پر عمل پیرا ہے. پھر ایک دن یہ تعجّب اُس وقت ختم ہوگیا جب اُنہوں نے جگر کو غرقِ شراب دیکھا.
"حضور آپ تو کہیں آتے جاتے نہیں، پھر یہ نشہ کیسا؟؟"
"میں نہیں جاتا لیکن احباب تو میر ے پاس آتے ہیں. اب وہ لے آتے ہیں تو بھئی مجھ سے انکار نہیں ہوتا."
نواب صاحب نے اب یہ پابندی لگا دی کہ کوئی ایسا شخص اُن کے پاس نہ آئے جو انہیں شراب لا کر د ے سکتا ہے.
جگر نے مُسکرا کر اِس پابندی کو بھی قبول کر لیا.
یہ پابندی اُس وقت دم توڑ گئی جب کسی نے دیوار کے ذریعے بوتل اندر پھینکی اور جگر نے دبوچ لی.
"جب میرا اللہ مجھے دیتا ہے
تو کوئی روکنے والا کون ہوتا ہے؟؟" جگر نے پکڑ ے جانے پر کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ایسی پابندیاں لگی رہیں تو بندہ یہاں سے کہیں اور چلا جائے گا.

.

شیرازن سے بدگمانی کا زخم تازہ تھا کہ لکھنؤ میں مشاعرہ ہوا. جگر نے دل نکال کر کاغذ پر رکھ دیا. وہ مشہورِ زمانہ غزل پڑھی جو مُدتوں تک گلی کُوچوں میں دہرائی جاتی رہی.

.

اک لفظِ محبت کا ادنی یہ فسانہ ہے

سِمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے

کیا حُسن نے سمجھا ہے! کیا عشق نے جانا ہے!
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

یہ کِس کا تصوّر ہے، یہ کِس کا فسانہ ہے؟
جو اشک ہے آنکھوں میں، تسبیح کا دانہ ہے

دل سنگِ ملامت کا ہرچند نشانہ ہے
دل پھر بھی مرا دل ہے، دل ہی تو زمانہ ہے

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے
رونے کو نہیں کوئی، ہنسنے کو زمانہ ہے

وہ اور وفا دشمن، مانیں گے نہ مانا ہے
سب دل کی شرارت ہے، آنکھوں کا بہانہ ہے

شاعر ہوں میں شاعر ہوں، میرا ہی زمانہ ہے
فطرت مرا آئینہ، قدرت مرا شانہ ہے

جو اُن پہ گزرتی ہے، کس نے اُسے جانا ہے؟
اپنی ہی مصیبت ہے، اپنا ہی فسانہ ہے

آغازِ محبت ہے، آنا ہے نہ جانا ہے
اشکوں کی حکومت ہے، آہوں کا زمانہ ہے

آنکھوں میں نمی سی ہے چُپ چُپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

ہم درد بدل نالاں، وہ دست بدل حیراں
ا ے عشق تو کیا ظالم، تیرا ہی زمانہ ہے

یا وہ تھے خفا ہم سے یا ہم ہیں خفا اُن سے
کل اُن کا زمانہ تھا، آج اپنا زمانہ ہے

ا ے عشق جُنوں پیشہ! ہاں عشق جنوں پیشہ!
آج ایک ستمگر کو ہنس ہنس کے رُلانا ہے

تھوڑی سی اجازت بھی، ا ے بزم گہِ ہستی
آ نکلے ہیں، دم بھر کو رونا ہے، رُلانا ہے

یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

خود حُسن و شباب اُن کا کیا کم ہے رقیب اپنا؟؟
جب دیکھئے، تب وہ ہیں، آئینہ ہے، شانا ہے

ہم عشقِ مجسّم ہیں، لب تشنہ و مستسقی
دریا سے طلب کیسی؟ دریا کو رُلانا ہے

تصویر کے دو رُخ ہیں جاں اور غمِ جاناں
اِک نقش چُھپانا ہے، اِک نقش دِکھانا ہے

یہ حُسن وجمال اُن کا، یہ عشق وشباب اپنا
جینے کی تمنّا ہے، مرنے کا زمانہ ہے

مجھ کو اِسی دُھن میں ہے ہر لحظہ بسر کرنا
اب آئے، وہ اب آئے، لازم اُنہیں آنا ہے

خوداری و محرومی، محرومی و خوداری
اب دل کو خدا رکھے، اب دل کا زمانہ ہے

اشکوں کے تبسّم میں، آہوں کے ترنّم میں
معصوم محبت کا معصوم فسانہ ہے

آنسو تو بہت سے ہیں آنکھوں میں جگر لیکن
بندھ جائے سو موتی ہے، رہ جائے سو دانا ہے

.

مشاعرے میں وہ غزل پڑھے اور چھائے نہ! یہ نہیں ہو سکتا تھا. وہ چھا گیا.

.

اب بھوپال ہاؤس اُس کا مُستقل مسکن تھا. جو بھی لکھنؤ آتا اُس کی زیارت کو ضرور جاتا. نوجوانوں کے لیے وہ اُستاد کی حیثیت اختیار کر گیا تھا.
"دیکھو وہ جگر صاحب!" ایک آواز آتی اور ہزاروں آنکھیں اُس طرف اُٹھ جاتی تھیں.

جگر کو احباب زبردستی تانگے پر بٹھا رہے ہیں۔ وہ بار بار نیچے اُترنے کی کوشش کرتا ہے۔ نشے میں دُھت ہے۔ معلوم ہوا حضرت علی گڑھ مشاعرہ پڑھنے جا رہے ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں مشاعرہ تھا۔ دُھن سوار ہوگئی، "تحصیلِ علم کا ایسا مُقدس ادارہ اور میں ٹرین میں جاؤں؟؟ پیدل جاؤں گا۔ سر کے بل جاؤں گا!"

علی گڑھ سے طلبہ اُسے لینے آئے تھے اور اسٹیشن لے جا رہے تھے۔

نوجوانوں میں بہت خوش ہوتا تھا۔ خصوصاً طلبہ کا بہت احترام کرتا تھا۔ ٹرین میں بیٹھا اور طلبہ نے خاطر تواضع شروع کی تو بہل گیا۔

ٹرین میں بھی یہ عالم رہا کہ جس اسٹیشن پر گاڑی رُک جاتی، دوسرے ڈبّوں سے لوگ اُتر کر اُسے دیکھنے آتے۔ جو دیدار سے محروم رہ جاتے، وہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رُکنے کا انتظار کرتے۔

علی گڑھ اسٹیشن پر جمِ غفیر تھا۔ طلبہ اُسے راستے بھر پلاتے ہوئے آئے تھے۔ اسٹیشن پر اُترتے ہی کسی طالبِ علم نے بوتل اُس کے منہ سے لگا دی۔

ہوٹل پہنچ کر بھی یہی شغل جاری رہا۔ طلبہ کے ہاتھ تو ایک کھلونہ آ گیا تھا۔ اِس کھیل میں جگر سے اُن کی عقیدت بھی تھی اور نوجوانی کی شرارت بھی۔

.

مشاعرے کا وقت ہوتے ہوتے مٹکوں شراب اُس کے پیٹ میں اُتر گئی۔ کوئی اور ہوتا تو قدموں کے ساتھ ساتھ اُس کا ظرف بھی بہک جاتا لیکن وہ جگر تھا۔ اِتنا ہوا کہ خود چل کر اسٹیج تک نہیں جا سکتا تھا۔

شور مچا "جگر صاحب آ گئے۔" مجمع بے قابو تھا۔ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ طلبہ اُسے دیکھنے کو ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ رضاکار حضرات نے راستہ بنایا۔ چند طلبہ اُسے سہارا دے کر اسٹیج پر لے گئے۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اُسے ایسے وقت مشاعرے میں لایا گیا تھا کہ اُسے آتے ہی کلام پڑھنا تھا۔

بے قابو مجمع چیخ چیخ کر اُس سے کلام سُننے کی اِستدعا کر رہا تھا۔

جگر نے آنکھیں کھولیں، ایک نظر سامعین پر ڈالی اور پھر اسٹیج پر بیٹھے ہوئے حضرات کا جائزہ لیا۔ مولانا احسن مارہروی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن پر نظر پڑتے ہی جیسے اُسے سکتہ ہوگیا۔

"پڑھو جگر۔" مولانا نے بڑی محبّت سے کہا۔

جگر نے چیخ مار کر اُن کے پاؤں پکڑ لیے۔ "میں گنہگار ہوں۔ آپ جیسی مُقدس ہستی کے سامنے اِس حال میں آ گیا۔ میں مجبور ہوں، قابلِ رحم ہوں۔ عیش و عشرت کے لیے شراب نہیں پیتا۔ میرے دل میں ناسور ہے۔ میں نے شراب میں اُس کا علاج ڈھونڈا ہے۔"

"جگر وہ بخشنے والا ہے۔ اُس کی رحمت پر یقین رکھو۔ مایوس مت ہو۔"

"مجھے اِس حال میں آپ کے سامنے نہیں آنا چاہئیے تھا۔"

"تمہیں احساس ہے۔ یہی تمہاری عظمت ہے۔ اللہ کو نیکی سے زیادہ ندامت پسند ہے۔ اور تم نادم ہونا جانتے ہو۔ مجھے یقین ہے تم ایک دن ضرور شراب چھوڑ دو گے۔"

مولانا تسلّیاں دے رہے تھے اور جگر کے آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آتے تھے۔

سامعین دم بخود تھے۔ عجیب رُوح پرور منظر تھا۔

"بچے تمہیں سُننے کے لیے بے تاب ہیں، پڑھو جگر۔" مولانا نے کہا۔

اب عالم یہ تھا کہ جگر کی داڑھی آنسوؤں میں تر تھی اور وہ اُس پانی سے لفظوں کے چہرے دھو رہا تھا۔

.

جب تک شبابِ عشق مکمّل شباب ہے
پانی بھی ہے شراب، ہوا بھی شراب ہے

.

یہ وقت ہی ایسا تھا کہ وہ جو بھی پڑھتا قابلِ قبول ہوتا، قابلِ داد ہوتا. قیامت برپا ہوگئی. لیکن اگلا شعر اُس نے ایسا پڑھ دیا کہ لوگ اپنے ہوش میں رہ گئے، بس یہی بہت تھا.

.

ا ے محتسب نہ پھینک! مر ے محتسب نہ پھینک!
ظالم شراب ہے! ار ے ظالم شراب ہے!!

.

کتنی ہی دیر تک یہ معلوم ہوتا رہا کہ اِس دنیا میں آوازوں کے سوا کچھ نہیں رہتا. لوگ چیخ چیخ کر تھک گئے.

.

ظالم شراب ہے! ار ے ظالم شراب ہے!!

.

پہلا مصرع وہ پڑھتا، دوسرا مصرعہ لوگ پڑھتے. نہ جانے کتنی دیر اُس مصرعے سے لُطف اُٹھاتے گزر گئی. آخر مولانا احسن مارہروی نے اعلان کیا.
"یہ شعر جگر نے ایسا نکالا ہے کہ اِس کے بعد مشاعرہ جاری رکھنے کا جواز نہیں رہتا لیکن ہم جگر کی غزل سے محروم بھی رہنا نہیں چاہتے. اِس لیے آپ سے گزارش ہے کہ جگر کو آگے پڑھنے دیں.
جگر نے اگلا شعر پڑھا.

.

مانوسِ اعتبارِ کرم کیوں کیا مجھے؟؟
اب ہر خطائے شوق اُسی کا جواب ہے!

.

اِس شعر میں بھی اظہارِ محبّت اور جراتِ رندانہ کا مظاہرہ اِس شوخ انداز سے کِیا تھا کہ لوگ بے اختیار ہو گئے.
اب وہ تھا اور سامعین کے تڑپتے ہوئے دل.

.

اپنی حُدود میں نہ بڑھے کوئی عشق میں
جو ذرّہ جس جگہ ہے، وہیں آفتاب ہے

وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اِس کا کیا علاج؟؟
دل مانتا ہی نہیں کہ نظر کامیاب ہے

میری نگاہِ شوق بھی کچھ کم نہیں مگر
پھر بھی ترا شباب ترا ہی شباب ہے

میں اُس کا آئینہ ہوں وہ ہے میرا آئینہ
میری نظر سے اُس کی نظر کامیاب ہے

تنہائیِ فراق کے قربان جائیے
میں ہوں، خیالِ یار ہے، چشمِ پُر آب ہے

سرمایہِ فراق جگر آہ! کچھ نہ پوچھ
اک جان ہے، سو اپنے لیے خود عذاب ہے
.
اُس دن علی گڑھ میں ہر زبان پر ایک مصرعہ تھا. "ظالم شراب ہے! ار ے ظالم شراب ہے!!
زبانوں پہ یہ مصرعہ تھا یا مولانا کے رُوبرو اظہارِ ندامت کا واقعہ. چرچا یہی تھا کہ جگر کا مذہبی احساس اُسے ہمیشہ اِس حال میں رہنے نہیں د ے گا.
عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ شراب نوشی ہو یا کوئی اور گناہ، سیاہیِ قلب بڑھتی ہی چلی جاتی ہے. لیکن اُس کا قلب آئینہ تھا. اُس کی رُوح داغدار نہیں ہوئی تھی. اُس کی رُوح اُس کی رندی قبول نہیں کر رہی تھی. اُس کا اضطراب اِسی کشمکش کا نتیجہ تھا. ہر وقت حالتِ جنگ میں تھا. یہ الگ بات تھی کہ اُسے ہمیشہ شکست ہو جاتی تھی. توبہ کرتا تھا مگر توڑ دیتا تھا.
اُس کا مذہبی احساس بہت ترقی یافتہ تھا. اِس کے مظاہر ے اُس کے طرزِ عمل سے اکثر ہوتے رہتے تھے.

جن دنوں وہ بھوپال ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا، حمید صدیقی اُن سے ملنے اکثر آ جاتے تھے. جگر اُن کا بہت احترام کرتا تھا. اُس نے اُن سے درخواست کی تھی کہ وہ اُس وقت اُس کے پاس نہ آیا کریں جب وہ عالمِ مدہوشی میں ہوا کر ے.
ایک روز وہ اُس سے ملنے گئے. جگر عالمِ سرشاری میں لیٹا ہوا کوئی غزل گُنگُنا رہا تھا.
تپائی پر بوتل رکھی تھی. گویا ابھی گُھونٹ گُھونٹ کر کے اُس نے اِس آگ کو پانی کِیا تھا.
جیسے ہی حمید صدیقی پر نظر پڑی، وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا.
"میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ ایسے وقت میر ے پاس نہ آیا کریں."
"جگر صاحب، کیا حرج ہے؟ میں آپ کے اِس شغل سے واقف بھی ہوں اور معترض بھی نہیں ہوں."
"بات معترض ہونے کی نہیں ہے. اب اِس عالم میں میں آپ سے نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سُنوں تو کیسے سُنوں؟؟"
"اللہ اکبر! جگر صاحب، اِس مدہوشی میں ایسا شعور!"
ایک طرف یہ احساس دوسری طرف نہ دن کی قید نہ رات کی. کبھی بل کھا کے پی گیا، کبھی لہرا کے پی گیا.
.
وہ مشاعر ے پڑھتا رہا. ہوش اور مدہوشی کے درمیان چکر کاٹتا رہا. نسیم کا خیال دامن گیر تھا. دوسری طرف شیرازن کی محبّت پاؤں کی زنجیر تھی. وہ اِن یادوں سے پیچھا چُھڑانے کے لیے خود کو شراب میں غرق کر رہا تھا. وہ دنیا میں گُھومتا لیکن لوٹ کر مین پور چلا آتا جہاں اُس کی

شیرازن رہتی تھی. گھومتا بھی تو شیرازن کے ساتھ گُھومتا. اُس کی ہر غزل شیرازن کے لیے تھی. پردہِ نگاری میں کوئی معشوق تھا جو بول بول پڑتا تھا. وہ ایک ایسے آدمی کی طرح ہر منزل سے دور بھاگ رہا تھا جیسے منزل کا علم نہ ہو لیکن منزل کی تلاش میں سرگرداں ہو.

.

اِسی تلاش و تجسّس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہوں تو کیونکر؟ جو ہوں، تو کیا ہوں میں؟؟

مجھے تلاش کر ا ے بے خودیِ شوقِ سُجود
پہنچ کے منزلِ ہستی پہ کھو گیا ہوں میں

جگر کی ہرزہ سرائی، مری یہ بے ربطی
یقیں ہوا کسی مجذوب کی صدا ہوں میں

.

بھوپال ہاؤس میں رہتے رہتے گھبرانے لگا تھا. رہتا کیا تھا، گُھوم پھر کر لوٹ آتا تھا. لیکن اُسے یہ ٹھکانہ بھی گوارا نہیں ہوا. وہ لکھنؤ سے نکلا اور بھوپال پہنچ گیا. وہ بھوپال ایک مشاعر ے میں گیا تھا لیکن ایک نوجوان کی ذہانت نے اُسے بھوپال پرست بنا دیا. اُس نے بھوپال کو یہ کہنے کے لائق بنا دیا کہ جگر نے یہاں کچھ دن قیام کیا تھا.
مشاعر ے کی ابتدا تھی. ایک نوجوان اسٹیج پر آیا اور غزل پڑھنی شروع کی. عجیب بے تُکی غزل تھی. ہر شعر میں کوئی نہ کوئی غلطی موجود تھی.
جگر نے آہستہ سے ٹوکا. مجبوراً اُسے پیچھے مُڑ کر دیکھنا پڑا. وہ لڑکا اُس مرتبہ تو برداشت کر گیا لیکن جب دوسر ے شعر پر بھی جگر نے اُسے ٹوکا تو اُس نے مُڑ کر دیکھا اور اِس طرح آداب کیا جیسے شعر پر داد ملتی ہے تو کرتے ہیں. وہ مسلسل یہی طریقہ اختیار کرتا گیا. جب جگر اُسے ٹوکتا، وہ آداب کرتا. لوگ یہ سمجھے کہ جگر تعریف کر رہا ہے تو کوئی بات ہوگی. دو چار شعروں کے بعد لوگوں نے بھی داد دینا شروع کر دی. اُس نے پوری کامیابی کے ساتھ غزل پڑھی اور خوب داد وصول کی.
جب پڑھ کر جانے لگا تو اُس نے جگر کی طرف منہ کر کے فرشی سلام کِیا.
"کہئیے حضور! کیسی رہی؟؟" اُس لڑکے نے کہا اور یہ جا وہ جا.
جگر اُس کی ذہانت پر مُسکرا کر رہ گئے. "بھئی یہ لڑکا بلا کا ذہین تھا."
"بھوپال کی زمین بڑی مردم خیز ہے جگر صاحب." کسی نے کہا.
"پھر تو ہم یہیں رہیں گے."
"میرا ایک مکان خالی پڑا ہے. آپ رہیں. آپ کے لیے حاضر ہے." مخمور جامعی نے کہا.

بھوپال کے قیام کا ایک اور یادگار واقعہ "دار الکہلا" کا قیام ہے.
جگر جہاں قیام کرتا تھا، اپنے اردگرد بے فکروں کو اِکٹھا کر لیتا تھا جن کے پاس وقت ہی وقت ہو. یہاں بھی اُسے ایسے احباب میسّر آ گئے. اُن بے فکروں کا سرخیل خود جگر تھا اور کوئی ہو بھی نہیں سکتا تھا. اُس سے زیادہ فرصت کس کے پاس تھی!

اِس فرصت کو دلچسپ بنانے کے لیے ایک عجیب و غریب تجویز پیش کی گئی. کہ کاہلوں کا ادارہ قائم کِیا جائے.
اُس ادار ے کا نام دار الکہلا رکھا گیا. جگر کو اُس ادارے کا صدر بنایا گیا اور حسرت لکھنوی کو نائب صدر. اُس ادارے کے ارکان کی اہلیت یہ تھی کہ جو جتنا بڑا کاہل ہوگا اُتنی ہی اہمیت کا حامل ہوگا. اُس ادار ے میں شمولیت کے لیے کاہلی کا امتحان دینا پڑتا تھا. اُس کی رُکنیت کا فائدہ یہ تھا کہ کارکن پڑا سوچتا رہے، غور کرتا رہے. کوئی نہ ہو جو اُس کی سوچوں میں دخیل ہو.
اُس ادار ے میں شمولیت کی کوئی فیس نہیں تھی. بس ممبر کو اپنا تکیہ اپنے ساتھ لانا پڑتا تھا.
.
مخمور جامعی کے گھر میں جہاں جگر ٹھہرا ہوا تھا، فرش پر پورال (سُوکھی گھاس) بچھا کر اُس پر سفید چاندنی بِچھا دی گئی تھی. اُس فرش پر تمام لوگ اپنے اپنے تکیے رکھ کر لیٹ جاتے تھے. اُس لیٹنے کو "اجلاس" کہتے تھے. جب اجلاس شروع ہو جاتا تو کاہلی کے تمام مظاہرے رُوبہ عمل لائے جاتے تھے. بات تک کرنے کو کاہلی کے خلاف سمجھا جاتا تھا. کروٹ بھی کسی نے بدلی تو سمجھا جاتا تھا کہ اُس نے کاہلی کے خلاف حرکت کی.
ایک روز ایک صاحب چِت لیٹے، ٹھاٹ سے حُقّہ پی رہے تھے کہ چلم کا ایک کوئلہ نکل کر اُن کے پیٹ پر گر گیا. کاہلی سے بعید تھا کہ وہ گھبراتے یا اُٹھ کر بیٹھ جاتے. اُنہوں نے صرف یہ کِیا کہ پیٹ کو ذرا سی حرکت دی اور کوئلہ نیچے گرا دیا.
دوسرے کاہل بڑی حسرت سے اُن کی حرکت کو دیکھ رہے تھے لیکن پھر اچانک کسی کو خیال آیا کہ اِس طرح تو فرش پہ آگ لگ جائے گی. فوراً اجلاس برخاست کِیا گیا اور کوئلے کو بُجھا کر ممکنہ آتش زدگی پر قابو پایا گیا. اُسی دن سے یہ قانون بنایا گیا کہ اضطراری حالت میں اجلاس برخاست کر دیا جائے گا. مثلاً کسی کو اپنی غزل سُنانی ہے یا پانی پینا ہے یا کوئی اور ایسی حاجت ہے تو وہ رُکن اجلاس مُلتوی کرنے کی درخواست کر سکتا ہے.
جگر آخر صدر تھا. کاہلی کے مقابلے میں بھی سرِ فہرست رہا. یعنی اُس کی جانب سے اجلاس مُلتوی کرنے کی کبھی درخواست دائر نہیں کی گئی.
کسی اور نے اُس ادار ے کی رُکنیت کا فائدہ نہ اُٹھایا ہو لیکن جگر نے اُس فرصت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس دور میں کئی یادگار غزلیں تخلیق کیں. یہ غزلیں بعد میں جگر کی نمائندہ غزلیں سمجھی گئیں. مثلاً
.
جو اب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا
تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا

نگاہوں سے چُھپ کر کہاں جائیے گا!
جہاں جائیےگا، ہمیں پائیے گا

مرا جب بُرا حال سُن پائیے گا
خراماں خراماں چلے آئیے گا

مٹا کر ہمیں آپ پچھتائیے گا

کمی کوئی محسوس فرمائیے گا

ہمیں بھی یہ اب دیکھنا ہے کہ ہم پر
کہاں تک توجہ نہ فرمائیے گا!

ستم عشق میں آپ آساں نہ سمجھیں
تڑپ جائیے گا، جو تڑپائیے گا

بُھلانا ہمارا، مبارک مبارک
مگر شرط یہ ہے، نہ یاد آئیے گا

ہمی جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل؟؟
کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا؟؟؟؟

یہ مانا کہ د ے کر ہمیں رنجِ فرقت
مداوائے فرقت نہ فرمائیے گا

محبّت، محبّت ہی رہتی ہے لیکن
کہاں تک طبیعت کو بہلائیے گا؟؟

جُنوں کی جگر کوئی حد بھی ہے آخر!
کہاں تک کسی پر ستم ڈھائیے گا؟؟

.

کابلی کے اُس مقابلے میں شریک ہو کر جگر بہت دن تک پردہِ ظاہر سے غائب رہا لیکن اب وہ اتنا غیر اہم نہیں تھا کہ وہ جو بُھولا تھا تو لوگ بھی اُسے بُھول جاتے. وہ جس کے لیے کہتا رہا تھا

.

فصلِ حُسن ہے اُن کی، موسمِ شباب اُن کا

.

اُس نے اپنے قصیدہ خواں کو ڈھونڈ نکالا. ڈھونڈنا کیا تھا، کہلوا بھیجا کہ "ایسی بھی کیا خفگی! فرصت ہو تو آن ملو."

اُس کا حال یہ کہ فرصت ہی فرصت تھی لیکن دل پھر بھی نہیں لگتا تھا. اُن دنوں وہ ایک ایسی چیز کی تمنّا کر رہا تھا جو اُس کے اختیار میں نہیں تھی.

.

بھوپال گرچہ خلد بہ داماں ہے ا ے جگر
دل کیا شگفتہ ہو کہ نسیمِ جگر نہیں

.

بھوپال اگرچہ خلد بہ داماں تھا لیکن وہ دل کی شگفتگی کے لیے ترس رہا تھا. جیسے جیسے عمر بڑھ رہی تھی، نوجوانی کی بہت سی غلطیاں پچھتاوا بن کر سامنے آ رہی تھیں. اُن میں ایک نسیم بھی تھی. اب اُسے شدّت سے احساس ہونے لگا تھا کہ اُس نے نسیم جیسی بیوی کی قدر نہیں کی. یہ پچھتاوا اُسے اور زیادہ، اور زیادہ، اور زیادہ پینے پر مجبور کر رہا تھا. وہ اپنا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا نہیں چاہتا تھا. اِس لیے غفلت اختیار کِیے رہتا تھا. دیوانے کو صحرا نے آواز دی اور وہ شیرازن کے پاس پہنچ گیا.

.

"جگر تم مجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہو؟ مجھے اپناتے بھی نہیں ہو، ٹھکراتے بھی نہیں ہو."
"میں کیا کروں، میرا تمہارا فراق کا رشتہ ہے."
"یہ فراق، وصال میں بھی تو بدل سکتا ہے."
"اُس کے لیے جس انتظار کی ضرورت ہے وہ تم سے ہوگا نہیں."
"میں قیامت تک انتظار کروں گی."
"پھر انتظار کرو. میر ے فیصلے تک، پردہِ غیب سے کچھ ظاہر ہونے تک."
"جگر تم تو شراب پی لیتے ہو، شاعری کر لیتے ہو. میں کس سُوئی سے دل کے زخموں کو ٹانکے دوں!"
جگر کے پاس اُس کی بہت ساری باتوں کی طرح اِس کا بھی کوئی جواب نہیں تھا. وہ مؤدبانہ سر جُھکائے بیٹھا تھا.
"میں گناہ کی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں."
"میں زندگی سے تنگ آ چکا ہوں."
"اب کب ملو گے؟"
"اب تو آتا رہوں گا."
وہ اتنی خاموشی سے آیا تھا کہ مین پور میں کسی پر اُس کی آمد نہیں کُھل سکی. لیکن پھر بھی نہ جانے کیسے خبر ہوگئی زمانے کو.
وہ بھوپال پہنچا تو کچھ لوگ جئے پور سے اُسے ڈھونڈتے ہوئے آئے بیٹھے تھے.
اُس کا دماغ اُس وقت ہرگز کسی کو برداشت کرنے کے لیے تیّار نہیں تھا لیکن اُس سے بے مروّتی ہوتی نہیں تھی. اُسے تو بڑ ے شاعروں کی طرح اپنی قیمت لگانے کا ہُنر بھی نہیں آیا تھا.

.

جئے پور میں مشاعرہ تھا. یہ لوگ اُسی مشاعرہ میں شرکت کے لیے اُسے آمادہ کرنے آئے تھے.
"آپ لوگ اتنی دور سے آئے ہیں، میں انکار کیسے کروں." جگر نے کہا.
"ہمار ے شہر میں آپ کبھی تشریف نہیں لائے ہیں. لوگ آپ کو سُننے کے مشتاق ہیں."
اور وہ تیّار ہوگیا.
وہ شیرازن سے مل کر آیا تو تھوڑی دیر کو نسیم کو بُھول گیا. اُسی خود فراموشی کے عالم میں وہ جئے پور پہنچ گیا.
اہلِ مشاعرہ کو معلوم تھا کہ جگر آ رہا ہے. لہذا وہ شراب کے دریا بوتلوں میں بند کر کے لے آئے.
وہ بھی اتنا ٹوٹ کر آیا تھا کہ بِکھرنے میں دیر نہیں لگی. ایسا کبھی نہیں بہکا تھا جیسا اب بہکا. سہار ے کم پڑ گئے. اُسے گود میں اُٹھا کر اسٹیج تک لے جایا گیا.

ہمیشہ سفر میں رہنے والا آج کسی ایک جگہ پر رُک گیا تھا. کسی کی فرمائش تھی یا خود اُس کی چاہت کہ دل سے نکلی اور ہونٹوں پر جم گئی.

"اُن کے لیے چُنری چاہئیے!"

پہلے تو کوئی نہیں سمجھا کہ معاملہ کیا ہے لیکن جب اُس نے اِس جُملے کو وردِ زبان بنا لیا تو بات سمجھ میں آ گئی.

"اُن کے لیے چُنری چاہئیے!"

"جگر صاحب وہ بھی آ جائے گی. لوگ آپ کا کلام سُننے کے لیے مُشتاق ہیں."

"سب کو اپنا خیال ہے. میرا خیال کسی کو نہیں. اُن کے لیے چُنری چاہئیے."

بہت سوں کو معلوم تھا کہ کس کے لیے چُنری چاہئیے. شیرازن سے اُس کی محبّت کا احوال چُھپا ہوا نہیں تھا. جئے پور آتے ہی جگر کو خیال آیا ہوگا کہ یہاں کی چُنریاں مشہور ہیں. وہ شیرازن کے لیے چُنری لے کر جائے گا. نشے میں یہی خیال اُس کے سامنے رہا.

چُنری کوئی ایسی بیش قیمت شے نہیں تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اتنی رات گئے کہاں سے آئے اور وہ اُس کے بغیر پڑھنے کے لیے تیّار نہیں تھا. اُس کا حل یہ نکالا گیا کہ کسی نے اپنے گھر سے چُنری لا کر اُس کے سامنے رکھ دی.

"جگر صاحب اب تو چُنری آ گئی. اب تو کچھ سُنائیے."

"اُن کے لیے چُنری آ گئی. اب اُن کے لیے غزل بھی سُنئیے."

اُس نے غزل پڑھنا شروع کی.

.

نظر سے حُسنِ دو عالم گرا دیا تُو نے
نہ جانے کون سا عالم دِکھا دیا تُو نے

فنائے عشق کو رنگِ بقا دیا تُو نے
حیات و موت کو یکجا دکھا دیا تُو نے

ہزار دل کو مِٹا کر دیا مجھ کو ایک درد
اُس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تُو نے

یہ کیا کِیا کہ عطا کر کے عشقِ لا محدود
مجھے حریفِ مُقابل بنا دیا تُو نے

.

آج وہ شیرازن کے حصار سے نکلنے کے لیے تیّار نہیں تھا. اُس نے چُنری کو ایک خاص ادا سے ہوا میں لہرایا اور دوسری غزل شروع کی.

.

اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب اُن کا
فصلِ حُسن ہے اُن کی، موسمِ شباب اُن کا

اوج پر جمال اُن کا، جوش پر شباب اُن کا

عہدِ مہ تاب اُن کا، دورِ آفتاب اُن کا

عرضِ شوق پر میری پہلے کچھ عتاب اُن کا
خاص اِک ادا کے ساتھ اُف وہ پھر حجاب اُن کا

رنگِ و بُو کی دنیا میں اب کہاں جواب اُن کا
عشق فرشِ بزم اُن کا، حِس بزمِ خواب اُن کا

پُھول مُسکراتے ہیں، دل پہ چوٹ پڑتی ہے
ہائے وہ رُخِ خندہ! اُف ر ے وہ شباب اُن کا

یونہی کُھلتے جاتے ہیں حُسن و عشق کے اسرار
اِک نفَس سوال اپنا، اِک نفَس جواب اُن کا

ضبط کا جنہیں دعوی عشق میں رہا اکثر
ہم نے حال دیکھا ہے بیشتر خراب اُن کا

اور کس کی یہ طاقت! اور کس کی یہ جرات؟
عشق آپ آڑھ اپنی، حُسن خود حجاب اُن کا

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکَت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشہِ نقاب اُن کا؟؟

تُو جگر کے مستوں پر طعن نہ کر ا ے واعظ
تُو غریب کیا جانے مسلکِ شراب اُن کا؟؟
.
جئے پور میں مشاعرہ پڑھنے کے بعد جب وہ بھوپال واپس آیا تو وہ چُنریاں ٹرین میں ہی کہیں چھوڑ آیا جو اُسے کارکنانِ مشاعرہ نے خرید کر دی تھیں. ہر سفر میں کچھ نہ کچھ بُھول کر آنا اُس کی پُرانی عادت تھی.
جیسے جیسے اُس کی شہرت بڑھتی جا رہی تھی، مشاعروں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی. علی گڑھ تو خیر اُس کا دوسرا گھر بن کر رہ گیا تھا. طلبہ اُس پر فدا تھے. رشید احمد صدیقی اُس کے خاص قدردان تھے. طلبہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر موقع نکالتے تھے اور جگر کو لے کر علی گڑھ پہنچ جاتے تھے. اگر معلوم ہو جاتا کہ کسی مشاعر ے سے واپس آ رہا ہے اور علی گڑھ سے گزر ے گا تو پلیٹ فارم طلبہ سے بھر جاتا. اُسے زبردستی اُتار لیتے تھے. مشاعروں کی گرم بازاری میں، بھوپال میں رہتے ہوئے بھی وہ بھوپال میں نہیں تھا. اُس کی غیر حاضری میں "دار الکہلا" کیسے قائم رہ سکتا تھا! سو جتنے کاہل تھے، سب بِکھر گئے.

اب وہ مشاعروں سے بھاگنے لگا تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ یہ مشاعر ے ہی اُس کی آمدنی کا ذریعہ بھی تھے اور پھر اُسے ایسی چشمِ مروّت ملی تھی کہ صاف انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اِس لیے مسافروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔
ایک مشاعرے کے سلسلہ میں ٹونک گیا۔ والیِ ٹونک کا مہمان تھا۔
ٹونک کے ایک واقعے نے اُسے احساس دلایا کہ اُس کی شہرت اُس کے لیے عذاب بن گئی ہے۔ اُس کی شہرت سے خوش ہونے والے بھی موجود تھے اور اُسی شہرت نے اُس کے دشمن بھی پیدا کر دیے تھے۔ ایسے ہی ایک حاسد نے اُس کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ کھانا کھاتے ہی اُس کی حالت غیر ہوگئی۔ پہلے تو لوگوں نے یہ سمجھا کہ شراب بہت پی لی ہے۔ لیکن جب حالت بہت بگڑنے لگی تو اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ معلوم ہوا اُسے زہر دیا گیا ہے۔ بروقت طبی امداد نے اُس کی جان بچا لی۔ ڈاکٹروں کا بھی یہ خیال تھا کہ اُس نے اتنی شراب پی ہے کہ زہر کا آدھا اثر بھی اُس پر نہیں ہو سکا۔

.

زہر دینے والا پکڑا گیا۔ اُس نے اپنا جرم قبول بھی کر لیا۔ ریاستوں میں کسی کو سزا دینا اتنا ہی آسان تھا جتنا انعام و اکرام سے نوازنا۔ اُسے بھی موت کی سزا ہو جاتی، کچھ بعید نہیں تھا۔ لیکن جب اُسے جگر کے سامنے لایا گیا تو اُس نے اُسے معاف کر دیا۔
"اِس شخص کو ممکن ہے میری ذات سے تکلیف پہنچی ہو۔ میں بھی اِسے معاف کرتا ہوں، یہ بھی مجھے معاف کر د ے۔"
"لیکن اِسے آپ کی جان لینے کا حق نہیں تھا۔" والیِ ٹونک نے کہا۔
"جان لی تو نہیں۔" جگر نے کہا۔
"کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہم کسی کو منہ دِکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ آپ ہمارے مہربان مہمان ہیں۔"
"اگر میں مر جاتا جو بے شک جو فیصلہ آپ کرتے۔ لیکن میں زندہ ہوں اور اِس شخص کو معاف کرتا ہوں۔ آپ بھی اِسے معاف فرما دیں۔"
جگر اِس طرح اپنے دشمن کی وکالت کر رہا تھا جیسے وہ اُس کا ازلی دوست ہو۔ بالآخر اُس نے والیِ ٹونک کو مجبور کر دیا کہ وہ اُس شخص کو معاف کر دیں۔
جگر کے حُسنِ سلوک سے وہ شخص اتنا متاثر ہوا کہ بھوپال تک اُن کے ساتھ آیا۔ جگر نے بڑی خوشامد کر کے اُسے واپس بھیجا۔
شاعروں کا یہ بے تاج بادشاہ اُس وقت ایسی حکومت کر رہا تھا کہ اُس کی شمولیت کے بغیر کسی مشاعرے کا تصوّر کِیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ چاہے وہ ہندوستان کے کسی بھی کونے میں ہو۔

.

اجمیر میں نعتیہ مشاعرہ تھا، فہرست بنانے والوں کے سامنے یہ مشکل تھی کہ جگر کو اس مشاعرے میں کیسے بُلایا جائے، وہ کھلا رند تھا اور نعتیہ مشاعرے میں اُس کی شرکت ممکن نہیں تھی۔ اگر فہرست میں اُس کانام نہ رکھا جائے تو پھر مشاعرہ ہی کیا ہوا؟؟ منتظمین کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوگیا۔ کچھ اُس کو بُلانے کے حق میں تھے اور کچھ خلاف تھے۔
دراصل جگر کا معاملہ تھا ہی بڑا اختلافی۔ بڑ ے بڑ ے شیوخ اور عارف باللہ اُس کی شراب نوشی کے باوجود اُس سے محبّت کرتے تھے۔ اُسے گناہ گار سمجھتے تھے لیکن لائقِ اصلاح۔ شریعت کے سختی سے پابند مولوی حضرات بھی اُس سے نفرت کرنے کے بجائے افسوس کرتے تھے کہ ہائے

کیسا اچھا آدمی کس برائی کا شکار ہے۔ عوام کے لیے وہ ایک اچھا شاعر تھا لیکن تھا شرابی۔ تمام رعایتوں کے باوجود مولوی حضرات بھی اور شاید عوام بھی یہ اجازت نہیں د ے سکتے تھے کہ وہ نعتیہ مشاعرے میں شریک ہو۔ آخر کار بہت سوچنے کے بعد منتظمینِ مشاعرہ نے فیصلہ کیا کہ جگر کو مدعو کیا جانا چاہیے۔ یہ اِتنا جرات مندانہ فیصلہ تھا کہ جگر کی عظمت کا اِس سے بڑا اعتراف نہیں ہوسکتا تھا.

جگر کو مدعو کیا گیا تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

"میں رند، سیہ کار، بد بخت اور نعتیہ مشاعرہ! نہیں صاحب نہیں'' ۔

اب منتظمین کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ جگر کو تیار کیسے کیا جائے۔ اُس کی تو آنکھوں سے آنسو اور ہونٹوں سے انکار رواں تھا. نعتیہ شاعر حمید صدیقی نے اُسے آمادہ کرنا چاہا، اُس کے مربی نواب علی حسن طاہر نے کوشش کی لیکن وہ کسی صورت تیار نہیں ہوتا تھا. بالآخر اصغر گونڈوی نے حکم دیا اور وہ چُپ ہوگیا.

سرہانے بوتل رکھی تھی، اُسے کہیں چُھپا دیا. دوستوں سے کہہ دیا کہ کوئی اُس کے سامنے شراب کا نام تک نہ لے۔

.

دل پر کوئی خنجر سے لکیریں کھینچتا تھا، وہ بے اختیار شراب کی طرف دوڑتا تھا مگر پھر رُک جاتا تھا. "شیرازن سے ہمارا رشتہ فراق کا ہے لیکن شراب سے تو نہیں، لیکن مجھے نعت لکھنی ہے. شراب کا ایک قطرہ بھی حلق سے اُترا تو کس زبان سے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح لکھوں گا!! یہ موقع ملا ہے تو مجھے اِسے کھونا نہیں چاہیے. شاید یہ میری بخشش کا آغاز ہو۔ شاید اِسی بہانے میری اصلاح ہو جائے. شاید مجھ پر اُس کملی والے صلی اللہ علیہ وسلم کا کرم ہوجائے. شاید خدا کو مجھ پر ترس آجائے۔"

ایک دن گزرا، دو دن گزر گئے، وہ سخت اذیّت میں تھا. نعت کے مضمون سوچتا تھا اور غزل کہنے لگتا تھا. سوچتا رہا، لکھتا رہا، کاٹتا رہا، لکھے ہوئے کو کاٹ کر تھکتا رہا. آخر ایک دن نعت کا مطلع ہوگیا۔ پھر ایک شعر ہوا. پھر تو جیسے بارشِ انوار ہوگئی۔ نعت مکمل ہوئی تو اُس نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

مشاعرے کے لیے اِس طرح روانہ ہوا جیسے حج کو جا رہا ہو۔ کونین کی دولت اُس کے پاس ہو۔ جیسے آج اُسے شہرت کی سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنا ہو۔ اُس نے کئی دن سے شراب نہیں پی تھی، لیکن حلق خشک نہیں تھا۔

اِدھر تو یہ حال تھا دوسری طرف مشاعرہ گاہ کے باہر اور شہر کے چوراہوں پر احتجاجی پوسٹر لگ گئے تھے کہ ایک شرابی سے نعت کیوں پڑھوائی جارہی ہے؟؟ لوگ بپھرے ہوئے تھے۔ اندیشہ تھا کہ جگر کو نقصان نہ پہنچ جائے. یہ خطرہ بھی تھا کہ لوگ اسٹیشن پر جمع ہو کر نعرے بازی نہ کریں۔

اِن حالات کو دیکھتے ہوئے منتظمین نے جگر کی آمد کو خفیہ رکھا تھا۔وہ کئی دن پہلے اجمیر پہنچ چکا تھا جب کہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ مشاعرے والے دن آئے گا۔

جگر اپنے خلاف ہونے والی اُن کارروائیوں کو خود دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ـ

.

کہاں پھر یہ مستی؟ کہاں ایسی ہستی؟؟
جگر کی جگر تک ہی مے خواریاں ہیں

.
آخر مشاعرے کی رات آ گئی۔جگر کو بڑی حفاظت کے ساتھ مشاعرے میں پہنچا دیا گیا۔
’’رئیس المتغزلین حضرت جگر مراد آبادی!‘‘
اِس اعلان کے ساتھ ہی ایک شور بلند ہوا، جگر نے بڑے تحمل کے ساتھ مجمع کی طرف دیکھا "آپ لوگ مجھے ہُوٹ کر رہے ہیں یا نعتِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو، جس کے پڑھنے کی سعادت مجھے ملنے والی ہے اور آپ سُننے کی سعادت سے محروم ہونا چاہتے ہیں۔"
شور کو جیسے سانپ سُونگھ گیا۔ بس یہی وہ وقفہ تھا جب جگر کے ٹوٹے ہوئے دل سے یہ صدا نکلی۔
.
اِک رند ہے اور مدحتِ سلطان مدینہ
ہاں کوئی نظر رحمتِ سلطان مدینہ

دامانِ نظر تنگ و فراوانیِ جلوہ
اے طلعتِ حق طلعتِ سلطانِ مدینہ

اے خاکِ مدینہ تری گلیوں کے تصدّق
تُو خُلد ہے تُو جنتِ سلطانِ مدینہ

اِس طرح کہ ہر سانس ہو مصروفِ عبادت
دیکھوں میں درِ دولتِ سلطانِ مدینہ

اِک ننگِ غمِ عشق بھی ہے منتظرِ دید
صدقے ترے اے صورتِ سلطانِ مدینہ

کونین کا غم یادِ خدا اور شفاعت
دولت ہے یہی دولتِ سلطانِ مدینہ

ظاہر میں غریب الغربا پھر بھی یہ عالم
شاہوں سے سِوا سطوتِ سلطانِ مدینہ

اِس اُمتِ عاصی سے نہ منھ پھیر خدایا
نازک ہے بہت غیرتِ سلطانِ مدینہ

کچھ ہم کو نہیں کام جگر اور کسی سے
کافی ہے بس اِک نسبتِ سلطانِ مدینہ
.

نعت کیا تھی! گناہ گار کے دل سے نکلی ہوئی آہ تھی، خواہشِ پناہ تھی. آنسوؤں کی سبیل تھی، بخشش کا خزینہ تھی۔ وہ خود رو رہا تھا اور سب کو رُلا رہا تھا. دل نرم ہوگئے، اختلافات ختم ہوگئے. رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا قصیدہ تھا. بھلا غصّے کی کھیتی کیونکر ہری رہتی!
"یہ نعت اِس شخص نے کہی نہیں ہے، اِس سے کہلوائی گئی ہے‘‘۔
مشاعر ے کے بعد سب کی زبان پر یہی ایک بات تھی۔

1936 کا سال اُس کے لیے حُزن و ملال کا سال بن گیا. اُس کے مُربی، دوست، غمخوار، جن کی وجہ سے اُس نے بھوپال ہاؤس میں دن گزار ے، بھوپال میں قیام کیا، جن کی وجہ سے اُن کا مجموعہ کلام "شعلہِ طُور" شائع ہوا، داغِ مفارقت دے گئے. اُن کی موت کا دکھ صرف وہی جان سکتا تھا.

.

ا ے غمِ دوست ترا صبر مجھی پہ ٹوٹے
بے تر ے نیند بھی آنکھوں میں اگر آئی ہو

.

ابھی اُس رتجگے کو مناتے ہوئے دس دن گزر ے تھے کہ ہوا نے اُس کا ایک اور چراغ بُجھا دیا. چراغ بھی ایسا کہ جس سے اُس کے حریمِ دل میں روشنی تھی.

.

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرتِ اصغر سے ارادت مجھ کو

.

اصغر گونڈوی کا انتقال ہو گیا. زندگی بھر وہ اُن کے سایہِ تربیت میں رہا تھا. ابھی تربیت ختم نہیں ہوئی تھی کہ سایہ اُٹھ گیا. ایسی تیز دھوپ سے اُسے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا. اُس نے گھبرا کر بے خودی کا دامن تھام لیا.

.

اِک بزمِ ناز میں چل، زاہد تجھے دِکھاؤں
مِینا بدوش آنکھیں، ساغر بہ کف نگاہیں

.

ایسے میں شیرازن کا سہارا بڑا سہارا تھا. وہ اُسے بُھول گیا تھا، ایسا تو نہیں تھا لیکن جس شدّت سے اب اُس کی یاد آ رہی تھی، کبھی نہیں آئی تھی.
وہ دنیا کی طرف سے آنکھیں پھیر کر شیرازن کے حضور مصروفِ طواف ہو گیا. اُس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی. تن بدن کا ہوش نہیں تھا. لگتا تھا دنیا کی شراب کم پڑ جائے گی. ہندوستان اُس کے لیے صحرا تھا جس میں وہ قیس کی طرح گھومتا پھر رہا تھا. چلتے چلتے تھک جاتا تو شیرازن کے حضور پل دو پل کے لیے بیٹھ جاتا. یہاں آ کر بھی اُسے قرار نہ آتا. بھاگنے کی فکر میں مُبتلا رہتا.

.

1938 میں شیرازن کی توبہ مکمّل ہو گئی. اُس نے اپنے پیشے کو خیر باد کہا اور حج پر جانے کی تیاری کرنے لگی. جگر کی بے قراری اور بڑھ گئی تھی. وہ شیرازن سے بھی گیا گزرا ہو گیا. اُسے کس دربار میں بُلایا جا رہا ہے! اب اُس کے دُکھوں میں ایک دُکھ کا اور اِضافہ ہو گیا. اُس کے

پاس تو ہر زہر کی ایک ہی دوا تھی. اُس نے قسم کھا لی تھی کہ اب ہوش میں نہیں آئے گا. اُس کے احباب اُس کی طرف سے مایوس ہو چلے تھے.

.

شیرازن حج سے واپس آ چکی تھی. وہ گُھومتا پھرتا مین پور آیا اور اطلاع ملی تو شیرازن سے ملنے چلا آیا. نشے میں قدم بہکے ہوئے، آنکھوں میں سُرخ ڈورے اور چہرے پہ رت جگوں کی گرد.

"سرکار کیا زمانے کی طرح تم بھی ہم سے رُوٹھ گئیں!"

وہ جگر کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح بے قرار ہو کر اُس کے سامنے نہیں آ گئی تھی. اِس لیے جگر کو خفگی کا احساس ہو رہا تھا.

"آپ سے خفگی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی. لیکن اب میں حج کر کے آئی ہوں. میں نے اللہ سے کچھ وعدے کیے ہیں جن پر مجھے چلنا ہے. اب میں آپ کے سامنے نہیں آ سکتی. میں پردہ کرنے لگی ہوں."

"کیا ہم سے بھی؟"

"جس کی ملازمت میں تھی اب اُس کے سامنے بھی نہیں آتی."

"ملازمت اور محبّت میں فرق ہوتا ہے."

"محبّت تو دلوں میں ہوتی ہے. اِس کے لیے سامنے آنا ضروری تو نہیں."

"کیا ہمیں حج کے تبرکات سے بھی نہیں نوازو گی؟"

"قطعاً نہیں. آپ شراب پیتے ہیں. اِس تبرک کو ہاتھ نہیں لگا سکتے."

"اگر میں شراب چھوڑ دوں؟"

"پھر بے شک، لیکن آپ ایسا کریں گے نہیں."

"میں تم سے عہد کرتا ہوں."

"میں کون ہوتی ہوں. اپنے اللہ سے عہد کیجئے."

"تمہیں گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں."

"تو پھر جائیے، غسل کر کے پاک ہو آئیے. میں حج کے تبرکات سے آپ کی ضیافت کروں گی."

جگر اپنے دوست نواب علی حسن طاہر سے کہا کرتا تھا "آپ فکر نہ کریں. میں توبہ کیے بغیر مروں گا نہیں." اصغر گونڈوی کہا کرتے تھے، "جگر ایک دن شراب ضرور چھوڑ دے گا." شاید اب وہ وقت آ گیا تھا.

وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے اُٹھ گیا. شیرازن یہی سمجھی کہ ناراض ہو کر گئے ہیں، اب کبھی نہیں آئیں گے. اُس نے اپنی آنکھوں کے گوشوں سے اُبھرنے والی نمی کو دوپٹے کے کونے سے صاف کیا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی.

.

درواز ے پر دستک ہوئی. کہیں لالہ دھرم داس تو نہیں ہیں؟ میں نے اُنہیں سختی سے منع کر دیا تھا لیکن یہ شوقین مزاج مرد ماننے والے کب ہیں.

"جگر صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں." ملازم نے آ کر بتایا.

"جگر آئے ہیں. پھر آئے ہیں." وہ گھبرا کے اُٹھی اور کمرے کے باہر بھاگی پھر خود بخود اُس کے قدم رُک گئے. اب میں وہ شیرازن نہیں ہوں.

"اُنہیں بِٹھاؤ." اُس نے ملازم سے کہا.

"وہ تشریف فرما ہو چکے ہیں."
وہ دروازے کے قریب پہنچی. "یا اللہ! یہ کیا بے قراری ہے. اب کیوں چلے آئے."
"میں پاک ہو کر آ گیا ہوں. اب تو تمہارے لائے ہوئے تبرک کو ہاتھ لگا سکتا ہوں؟"
گھر میں مِٹھائی رکھی تھی. حج سے کھجوریں لائی تھی. آبِ زمزم تھا.
"یہ چیزیں جگر صاحب کو لے جا کر دے دو."
"شیرازن، کیا اب بھی ہمارے سامنے نہیں آؤ گی؟"
"یہ ضد نہ کیجئے، آپ میرے لیے نا محرم ہیں."
جذبات کا عجیب بھنور تھا، جس میں جگر پھنسا ہوا تھا. شیرازن سے بچھڑنے کا دُکھ تھا یا اُس مقدّس تبرک کی موجودگی کا اِحساس، اُس کا دل بھر آیا. اُس نے تبرک کو آنکھوں سے لگایا، ہونٹوں سے چُوما اور دل سے قبول کیا.
"اچھا شیرازن، اب میں چلتا ہوں."
"اب میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ پھر آئیے گا لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ مجھے بُھول جائیے گا."
.
جو اب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا
تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا

نگاہوں سے چُھپ کر کہاں جائیے گا!
جہاں جائیے گا، ہمیں پائیے گا

مرا جب بُرا حال سُن پائیے گا
خراماں خراماں چلے آئیے گا

مٹا کر ہمیں آپ پچھتائیے گا
کمی کوئی محسوس فرمائیے گا

ہمیں بھی یہ اب دیکھنا ہے کہ ہم پر
کہاں تک توجہ نہ فرمائیے گا!

ستم عشق میں آپ آساں نہ سمجھیں
تڑپ جائیے گا، جو تڑپائیے گا

بُھلانا ہمارا، مبارک مبارک!
مگر شرط یہ ہے، نہ یاد آئیے گا

ہمی جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل؟؟
کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا؟؟؟؟

یہ مانا کہ د ے کر ہمیں رنجِ فرقت
مداوائے فرقت نہ فرمائیے گا

محبّت، محبّت ہی رہتی ہے لیکن
کہاں تک طبیعت کو بہلائیے گا؟؟

جُنوں کی جگر کوئی حد بھی ہے آخر!
کہاں تک کسی پر ستم ڈھائیے گا؟؟

.

جگر نے آخری مرتبہ اُس کے گھر کے در و دیوار کو دیکھا اور وہاں سے نکل آیا.

اصغر کا انتقال ہو چکا تھا اور نسیم بیوگی کے دن گزار رہی تھی. جگر کو شراب چھوڑتے ہی نسیم کی یاد نے بے قرار کر دیا. نسیم کو اُس کی شراب نوشی سے اختلاف تھا اور کوئی جھگڑا نہیں تھا. اب شراب چھوڑ دی، اختلاف ختم ہو گیا.
میری محبّت اُس کے دل میں اب بھی باقی ہوگی لیکن اب وہ میر ے لیے غیر ہے. غیرت کی یہ دیوار ختم بھی ہو سکتی ہے. میں نسیم سے شادی کر سکتا ہوں. اِس خیال کے آتے ہی وہ گونڈہ پہنچ گیا. کچھ دوستوں کے ذریعے اُس نے اپنی خواہش کو نسیم تک پہنچایا.
اُس کی توبہ کا اعتبار نہیں تھا. نسیم کے گھر والوں نے رشتے سے انکار کر دیا. شاہ منگلوری کا انتقال ہو چکا تھا. اُن کے صاحب زاد ے تک بھی یہ معاملہ پہنچا. اُنہوں نے بھی مخالفت کی. غرض نسیم کے گھر والے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوتے تھے. اصغر کی وصیّت درمیان میں آ گئی لیکن سوال یہی تھا کہ جگر نے شراب چھوڑی بھی ہے؟ بالآخر نسیم نے فیصلہ کن بات کہہ دی.
"اگر جگر نے ایک سال تک شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تو میں اُن سے شادی کر لوں گی."
جگر نے اُس فیصلے کو قبول کر لیا.
نسیم کیا، کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی توبہ پر قائم رہے گا. اِس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ توبہ کر چکا تھا لیکن ہر مرتبہ کبھی گھبرا کے پی گیا تو کبھی لہرا کے پی گیا. سب کو یقین تھا کہ اِس مرتبہ بھی اُس کی توبہ کا یہی حشر ہوگا.

.

اُس نے چودہ پندرہ سال کی عمر میں شراب پینی شروع کی تھی. اُس کا لہو شراب بن چکا تھا. یک لخت شراب ترک کر دینا مذاق نہیں تھا.
کثرتِ شراب نوشی سے اعصاب کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں. یہ وقتِ فیصلہ باقی رہتی ہے، نہ حوصلہ. اِس لیے شراب چھوڑنے والا اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہتا.

.

اللہ اگر توفیق نہ د ے، انسان کے بس کا کام نہیں

.

ترکِ گناہ کے لیے قوّتِ ایمانی کی ضرورت ہوتی ہے. کسی کی دعاؤں سے اُسے وہ قوّت عطا ہوگئی تھی.

سال بھر گزر گیا. کہیں سے شہادت نہیں ملی کہ اُس نے شراب کو ہاتھ بھی لگایا ہو. گونڈہ کا وہ شراب خانہ جہاں کے چکر کاٹتے کبھی اُس کے قدم نہ تھکتے تھے، اب یہ حال ہو گیا کہ اُس سے گزرنا ہی چھوڑ دیا.
"بھئی اب شراب کی بُو برداشت نہیں ہوتی."
وہ جسمانی طور پر شراب و شیرازن سے دور ہو گیا تھا لیکن بہت دن تک اُسے یہ یادیں پریشان کرتی رہیں.
.
کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بُجھا جاتا ہے دل چہر ے کی تابانی نہیں جاتی

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

طبیعت آ کے پھر تا حدِّ اِمکانی نہیں جاتی
نہیں جاتی، نہیں جاتی، یہ دیوانی نہیں جاتی

نگاہوں کو خزاں نا آشناں بننا تو آ جائے
چمن جب تک چمن ہے، جلوہ سامانی نہیں جاتی

پشیمانِ ستم وہ دل ہی دل میں رہتے ہیں لیکن
خوشا حُسنے کہ طرزِ ناپشیمانی نہیں جاتی

مزاجِ اہلِ دل بے کیف و مستی رہ نہیں سکتا
کہ جیسے نکہتِ گل سے پشیمانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینے سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی

بُلندی چاہئیے انسان کی فطرت میں پوشیدہ
کوئی ہو بھیس لیکن شانِ سُلطانی نہیں جاتی

گئے وہ دن کہ دل سرمایہ دارِ درد پیہم تھا
مگر آنکھوں کی اب تک میر سامانی نہیں جاتی

جسے رونق تر ے قدموں نے د ے کر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو، اُس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

مجھے تو کر دیا سیراب ساقی نے مر ے, لیکن
مری سیرابیوں کی تَشنہ سامانی نہیں جاتی

نہیں معلوم کس عالم میں حُسنِ یار دیکھا تھا
کوئی عالم ہو لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی

جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

محبت میں اِک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جگر وہ بھی ز سر تا پا محبّت ہی محبّت ہیں
مگر اُن کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

.

آنسو خشک ہو گئے تھے لیکن طغیانی نہیں جاتی تھی. دل میں کوئی رہ رہ کر چُٹکیاں لیتا تھا لیکن دونوں درواز ے اُس کی مخالف سَمت میں بند ہو گئے تھے. نہ مے کدہ کُھلا تھا نہ شیرازن کا دروازہ.

.

وہ زمانے کو حیرت میں ڈبوتا ہوا آگے بڑھتا رہا. جگر نے شراب چھوڑ دی؟؟ جس نے یہ خبر سُنی، حیرت سے سُنی. کچھ نے شکر ادا کِیا کہ جگر جیسا آدمی زیادہ دیر اِس بُرائی کے ساتھ چل نہیں سکتا تھا.
"جگر تم کمزور آدمی ہو." جوش ملیح آبادی نے اُس سے کہا.
"اپنی رَوِش بدل لی! مجھے دیکھو جہاں تھا وہیں ہوں. آج تک دھڑلے سے پی رہا ہوں."
یہ سُن کر جگر نے کہا "میں ریل کی طرح ہوں جو آگے بڑھتی رہتی ہے. تم ریل کے کھمبے کی طرح ہو. بے جان. ایک جگہ ٹھہر ے ہوئے."

.

کسی کو فکر تھی کہ جگر نے زندگی کا ایک بڑا حصّہ شراب کے ساتھ گزارا ہے، شراب چھوڑنے کے بعد اُس کی شاعری یقیناً ختم ہو جائے گی. اگر ختم نہیں بھی ہوئی تو اُس میں وہ بات نہیں رہے گی جو جگر کی پہچان تھی.
"جناب آپ کو اگر یہ غلط فہمی ہے کہ میں شراب پی کر شعر کہتا تھا تو اِس غلط فہمی کو دور کر لیجئے. شاید چند ہی غزلیں ہوں گی جو میں نے نشے کی حالت میں کہی ہوں گی. میں تو دورِ رندی میں بھی غزل کہتے ہوئے شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا."

وہ ہر اعتراض کو رد کرتا ہوا اپنے عہد پر قائم رہا. اُس ایفائے عہد میں اُس پر جو گزری، اُس کا دل ہی جانتا ہوگا.
شراب کیا چُھوٹی، وہ دنیا بھر میں اکیلا رہ گیا. اُسے وقت گزارنے کے لیے کچھ سہاروں کی ضرورت شدّت سے محسوس ہونے لگی. اُس نے سگریٹ اور چائے کو شراب کا نعم البدل بنایا. اُس کی انتہا پسند فطرت نے یہاں بھی کام دِکھایا. سگریٹ نوشی شروع کی تو اِس کثرت سے کہ لگتا تھا دنیا بھر کے سگریٹ دھواں بنا کر اُڑا دے گا. ایک پیالی ختم نہیں ہوتی تھی کہ دوسری آ جاتی تھی. ہر پیالی کے ساتھ سگریٹ الگ پُھونکتا رہتا. چائے بھی ایسی کڑوی پیتا کہ دوسرا آدمی ایک گھونٹ نہیں پی سکتا تھا.
اُسے دل کا دورہ پڑ چکا تھا. شراب ترک کرنے کے بعد طرح طرح کی بیماریاں بھی سر اُٹھانے لگی تھیں. اِس لیے سگریٹ نوشی اُس کے لیے شراب سے بھی زیادہ خطرناک ہو سکتی تھی. ڈاکٹروں نے اُسے مشورہ بھی دیا تھا لیکن سگریٹ کے ساتھ گناہ کا احساس نہیں تھا جو اُسے پریشان کرتا. تلخ چائے اور سگریٹ اُس کا اوڑھنا بچھونا بن گئے.
اُن دنوں تاش کھیلنا بھی اُس کا محبوب مشغلہ تھا جو ساری عمر باقی رہا. دراصل وہ اپنے ذہن کو کسی وقت خالی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا. وہ نہیں چاہتا تھا کہ شراب کا خیال تک آئے. تنہائی میں بہک سکتا تھا، اِس لیے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے راتیں گزارتا تھا.
سگریٹ، تاش، چائے اور راتوں کو جاگنا. اب یہی اُس کی زندگی تھی.
اُس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ شراب چھوڑ چکا ہے. اب نسیم کو اُس سے نکاح کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا تھا. جگر نے نسیم سے نکاح کر لیا.
اِس حسین حادثے کو جگر نے "تجدیدِ ملاقات" کا عنوان دیا اور یوں سُخن طراز ہوا کہ
.
مدّت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم
خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم

نغموں میں سمویا ہوا وہ رات کا عالم
وہ عِطر میں ڈوبے ہوئے لمحات کا عالم

اللہ رے، وہ شدّتِ جذبات کا عالم
کچھ کہہ کے وہ بُھولی ہوئی ہر بات کا عالم

وہ سادگیِ حُسن، وہ مَحجوبِ نگاہی
وہ محشرِ صد شکر و شکایات کا عالم

نظروں سے وہ معصوم محبّت کی تراوش
چہرے پہ وہ مشکوک خیالات کا عالم

عارض سے ڈھلکتے ہوئے شبنم کے وہ قطرے
آنکھوں سے جَھلکتا ہوا برسات کا عالم

بے شرطِ تکلّف و پذیرائیِ اُلفت
بے قیدِ تصنع وہ مدارات کا عالم

ایک ایک نظر شعر و شباب و مے نغمہ
ایک ایک ادا حُسنِ مُحاکات کا عالم

وہ نظروں ہی نظروں میں سوالات کی دنیا
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جوابات کا عالم

نازک سے ترنّم میں اشارات کے دفتر
ہلکے سے تبسّم میں کنایات کا عالم

پاکیزگیِ عصمت و جذبات کی دنیا
دوشیزگیِ حُسنِ خیالات کا عالم

برہم وہ نظامِ دل و دنیائے تمنّا
پیہم وہ شکستوں میں فتوحات کا عالم

وہ عشق کی بربادیِ زندہ کا مُرقّع
وہ حُسن کی مائندہ کرامات کا عالم

وہ عارضِ پُر نور، وہ کیفِ نگہِ شوق!
جیسے کہ دمِ صبح مُناجات کا عالم

وہ جراءتِ بے باک، وہ شوخی، وہ شرارت
وہ حُسن و محبّت کی مساوات کا عالم

تھک جانے کے انداز میں وہ دعوتِ جراءت
کھو جانے کی صورت میں وہ جذبات کا عالم

شرمائی لجائی ہوئی وہ حُسن کی دنیا
وہ مہکی ہوئی، بہکی ہوئی رات کا عالم

وہ عرش سے تا فرش برستے ہوئے انوار
وہ تہنیتِ ارض و سماوات کا عالم

تا صبح وہ تصدیقِ محبّت کے نظارے
تا شام پھر وہ فخر و مُباحات کا عالم

عالم مری نظروں میں جگر اور ہی کچھ ہے
عالم ہے اگرچہ وہی دن رات کا عالم

دورِ غرقابی ختم ہوا. اُس نے ڈرتے ڈرتے ہوش کی دنیا میں قدم رکھا. گرد و پیش پر نظر ڈالی. دنیا ہی بدل چکی تھی. ادبی دنیا میں ترقی کا دور دورہ تھا. وہ خود کو اُس سے الگ تھلگ نہیں رکھ سکتا تھا. یہاں سے اُس کی شاعری ایک نئے ذائقے سے آشنا ہوئی. بُھوک، افلاس، انقلاب کی خواہش، عوام کی حالتِ زار. نشہ اُترتے ہی اُسے سب کچھ نظر آنے لگا. اُس جیسا غزل گو یہ کہنے پر مجبور ہو گیا.

.

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

دل کی جراحتوں کے کِھلے ہیں چمن چمن
اور اِس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل

.

سُننے والوں نے تعجّب سے سُنا اور پھر ذرا دیر میں اُس کی بات سمجھ میں آ گئی. وہ یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ غزل نہیں کہی جائے گی بلکہ مطلب یہ تھا کہ اب غزل کے مضامین میں تبدیلی کی ضرورت ہے.

.

سازِ حیات، سازِ شکستہ ہے اِن دنوں
بزمِ خیال جبتِ ویراں ہے آج کل

.

زندگی کا ساز اپنی آواز کھو چکا تھا. ضرورت تھی کہ شکستہ ساز کی دوستی کے لیے کچھ کِیا جاتا.

جگر کے نزدیک حیات کا ساز، مادی آسودگی اور ظاہری چمک دمک سے نغمہ ریز نہیں ہوتا بلکہ اُس کے لیے باطنی آسودگی، راست کرداری، جراءت مندانہ خلوص اور وسعتِ نظر کی ضرورت ہوتی ہے. اُس نے خارجی حالات پر تنقید کے ساتھ ساتھ باطنی ترقی کو بھی اپنا موضوع بنایا.

مثلاً اُس دور کی کچھ نمائندہ غزلیں دیکھئیے.

.

نہ تابِ مستی، نہ ہوشِ ہستی، کہ شکرِ نعمت ادا کریں گے
خزاں میں جب ہے یہ اپنا عالم، بہار آئی تو کیا کریں گے!

ہر ایک غم کو فروغ دے کر یہاں تک آراستہ کریں گے

وہی جو رہتے ہیں دور ہم سے، خود اپنی آغوش وا کریں گے

جدھر سے گزریں گے سرفروشانہ کارنامے سُنا کریں گے
وہ اپنے دل کو ہزار روکیں، مری محبّت کو کیا کریں گے؟؟

نہ شکرِ غم زیرِ لب کریں گے، نہ شکوہِ برملا کریں گے
جو ہم پہ گزر ے گی دل ہی دل میں، کہا کریں گے، سُنا کریں گے

یہ ظاہری جلوہ ہائے رنگیں فریب کب تک دیا کریں گے!
نظر کی جو کر سکے نہ تسکیں، وہ دل کی تسکین کیا کریں گے؟؟

وہاں بھی آہیں بھرا کریں گے، وہاں بھی نالے کِیا کریں گے
جنہیں ہے تجھ سے ہی صرف نسبت، وہ تیری جنّت کو کیا کریں گے؟؟

نہیں ہے جن کو مجالِ ہستی سوائے اِس کے وہ کیا کریں گے؟
کہ جس زمیں کے ہیں بسنے والے اُسی کو رُسوا کِیا کریں گے

ہم اپنی کیوں طرزِ فکر چھوڑیں؟ ہم اپنی کیوں وضعِ خاص بدلیں؟؟
کہ انقلابات نو بہ نو تو ہوا کِیے ہیں، ہوا کریں گے
**
یادَش بخیر! جب وہ تصوّر میں آ گیا
شعر و شباب و حُسن کا دریا بہا گیا

جب عشق اپنے مرکزِ اصلی پہ آ گیا
خود بن گیا حسین، دو عالم پہ چھا گیا

جو دل کا راز تھا اُسے کچھ دل ہی پا گیا
وہ کر سکے بیاں، نہ ہمیں سے کہا گیا

ناصح فسانہ اپنا ہنسی میں اُڑا گیا
خوش فکر تھا کہ صاف یہ پہلو بچا گیا

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا!!

دل بن گیا نگاہ، نگہ بن گئی زباں
آج اِک سکوتِ شوق قیامت ہی ڈھا گیا

میرا کمالِ شعر بس اِتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے، میں زمانے پہ چھا گیا
**
وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتحِ زمانہ

یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ

کبھی حُسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہی نازِ بے نیازی، وہی شانِ خُسروانہ

میں ہوں اُس مقام پر اب کہ فراق و وصل کیسے؟؟
مرا عشق بھی کہانی، ترا حُسن بھی فسانہ!

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہئیے بہانہ!

ترے عشق کی کرامت، یہ اگر نہیں تو کیا ہے؟؟
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

تری دُوری و حضوری کا عجیب ہے یہ عالم
ابھی زندگی حقیقت، ابھی زندگی فسانہ

مرے ہم صفیر بُلبُل، مرا تیرا ساتھ ہی کیا!
میں ضمیرِ دشت و دریا، تُو اسیرِ آشیانہ!!

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں؟؟ ہے جو فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد دردِ تنہا، مرا غم غمِ زمانہ

ترے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا!
تجھے اے جگر مبارک! یہ شکستِ فاتحانہ
**
جہلِ خِرد نے دن یہ دِکھائے
گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے

ہائے وہ کیونکر دل بہلائے!
غم بھی جس کو راس نہ آئے

ضد پر عشق اگر آ جائے
پانی چِھڑکے، آگ لگائے

دل پہ کچھ ایسا وقت پڑا ہے
بھاگے لیکن راہ نہ پائے

کیسا مجاز؟ اور کیسی حقیقت؟؟
اپنے ہی جلو ے، اپنے ہی سائے

جُھوٹی ہے ہر ایک مسرّت
رُوح اگر تسکین نہ پائے

کارِ زمانہ جتنا جتنا
بنتا جائے، بگڑتا جائے

ضبطِ محبّت، شرطِ محبّت
جی ہے کہ ظالم اُمڈا آئے

حُسن وہی ہے حُسن جو ظالم
ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
رُوح سُنے اور رُوح سُنائے

راہِ جُنوں آسان ہوئی ہے
زلف و مِژہ کے سائے سائے
.
یہ ایک بلکل بدلی ہوئی دنیا تھی جس کی جھلکیاں وہ دِکھا رہا تھا.
اُس کی شاعری کے بار ے میں اب تک عام طور پر یہ رائے تھی کہ اُس میں شراب و شباب کی پُر کیف مستیاں ہیں اور اُسے سماجی تنقید سے سروکار نہیں لیکن رندی کا زمانہ گزرتے ہی اُس کی رائے میں تبدیلی آئی.
اُس نے ثابت کر دیا کہ اُس کی قوّتِ تغزل اِس قدر پُر تاثیر ہے کہ وہ خیال کے براہِ راست اِظہار کے باوجود شعریت اور تغزل کے انداز کو برقرار رکھ سکتا ہے. جگر کی کوئی غزل، غزل کے کیف سے خالی نہیں تھی.

.
اُس نے اپنی زندگی بدلتے ہی شاعری کی ڈگر بھی بدل دی. اب تک اُس کے سنگیت اپنے لیے تھے لیکن اب وہ زمانے کا نغمہ خواں بن گیا.
ہوش مندی کا اِس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا تھا کہ ترقی پسند جس قسم کی شاعری کا مطالبہ کر رہے تھے، چند چیزوں سے اختلاف کے باوجود اُس کی شاعری اُس ضرورت کو پورا کر رہی تھی.
وہ بدستور مشاعروں کی ضرورت بنا رہا. نوجوان شعراء میں اُس کا احترام بدستور موجود رہا.
وہ عالم فاضل نہیں تھا، شعر و ادب پر اُس کی گفتگو فلسفیانہ نہیں ہوتی تھی. لیکن اُس کے احساس کی شدّت اور جذبے کی فراوانی نے اُس کی شاعری کو پِھیکا نہیں ہونے دیا. اُس کی شاعری وقت کی رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی رہی.
اگر ایک زمانے میں شراب و شباب کی لذّت پر لوگ اُس کی شاعری سُن کر سر دُھنتے تھے تو اب اِس لیے پسند کرتے تھے کہ دیکھیں اُس نے دنیا کو کس نظر سے دیکھا ہے.
اُس کی رندی کا دور ختم ہو گیا تھا لیکن اُس کی جراءتِ رندانہ ابھی بھی موجود تھی.
انگریزوں کے دور میں قیصر باغ لکھنؤ کے ایک مشاعر ے میں ایک انگریز کی صدارت کے باوجود اُس نے اپنی نظم "قحطِ بنگال" پڑھی.
.
بنگال کے میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن، خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں

تعمیر کے پرد ے میں بہ اندازِ حکومت
تخریب بہ عنوانِ دِگر دیکھ رہا ہوں

انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف اِن آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

اربابِ وطن کو مری جانب سے ہو مُژدہ
اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں

جو خواب کہ شرمندہِ تعبیر تھا اب تک
اب خواب کی تعبیر جگر دیکھ رہا ہوں
.
اب اُس کے پاس دولت بھی تھی، شہرت بھی تھی اور عزّت بھی. شراب چھوڑ ہی چکا تھا. نسیم کو اُس سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی تھی. شاعرانہ آوارگی ضرور برقرار تھی لیکن اِتنا تو نسیم کو بھی معلوم تھا کہ وہ شاعر ہے. تاش کھیلنے کا شوق ایسا تھا کہ کئی کئی راتیں ایک نشست سے

بیٹھے ہوئے گزر جاتی تھیں. مشاعروں کی مصروفیت ایسی تھی کہ ہفتوں گھر آنا نصیب نہ ہوتا. ہندوستان کا ہر کونہ وہ کئی کئی مرتبہ پھلانگ چکا تھا.
اب عمر ایسی نہیں تھی کہ ہر سختی بہ آسانی جھیل جاتا. طویل عرصہ تک شراب خوری کے اثرات اب ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے. بے اعتدالیوں اور مُستقل رت جگوں نے اُس کے اعصاب پر بُرا اثر ڈالا تھا.
اُس نے اِن سب باتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مشاعروں کو خود پر حرام کرنے کی ٹھان لی.

کچھ دن اُس پر عمل بھی کِیا لیکن یہ مشاعرے ہی ذریعۂ معاش تھے. وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور ہو گیا. اُسے مجبوراً مشاعروں میں شرکت پر راضی ہونا پڑا.
دوسری عالم گیر جنگ کی تباہ کاریوں سے ہندوستان بھی متاثر ہو رہا تھا. اُس کے دوش بہ دوش ہندوستان کی سیاست بھی کروٹ بدل رہی تھی. آزادی کی کوششیں تیز ترین ہو چکی تھیں. انگریزوں کے نظامِ مملکت میں ہندو مسلم اختلافات کا آغاز ہو چکا تھا. اُس کے پہلو بہ پہلو ایسے نفسیاتی عوارض کے مظاہرے بھی نظر آنے لگے تھے، جن کا شکار ایسے حالات میں قومیں ہو جاتی ہیں.
جگر سیاسی آدمی نہیں تھا لیکن ایک قومی شعور ضرور رکھتا تھا. ایک ایسے انسانی سماج کا تصوّر رکھتا تھا جس میں افراد خود غرضی اور تعصّب کی بجائے محبّت، راست کرداری اور خلوص کو نظامِ حیات قرار د ے سکیں. اگر انسان لالچ، تنگ دلی اور تعصّب سے نہیں نکل سکتا تو ترقی بے کار ہے. ایک مرتبہ اُس نے کہا تھا

.

تسخیرِ مہر و ماہ مبارک تجھے مبارک
دل میں اگر نہیں تو کہیں روشنی نہیں

.

اب نہایت سنجیدگی سے یہ مضامین اُس کی شاعری کا حصّہ بن رہے تھے. یہاں اُس کی شاعری نے یہ الزام دھو دیا کہ غزل میں صرف عشق و عاشقی کے مضامین بیان ہو سکتے ہیں. حسرت موہانی نے بھی اپنی غزل سے یہی کام لیا تھا لیکن تغزل کا جو رچاؤ جگر کے ہاں تھا، حسرت کو نہیں ملا.
اُس نے کٹّر غزل گو ہونے کے باوجود نظم گوئی کا رستہ بھی اختیار کِیا. وہ ہنگامی اور خارجی مضامین جن کے لیے تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے، غزل کی جگہ نظم کا رستہ اختیار کِیا. اُس نے اُن نظموں میں بھی تغزل کی وہ دلکشی پیدا کر دی جو کسی دوسر ے نظم گو کو نصیب نہ ہوئی.
1947 میں یہ شاعرِ خوش فکر اِس انداز میں نغمہ سرا ہوا.

.

بھاگ مسافر میر ے وطن سے، میر ے وطن سے بھاگ
اوپر اوپر پُھول کِھلے ہیں، بِھیتر بِھیتر آگ
بھاگ مسافر بھاگ!
گاندھی جی کا نام زباں پر، من کے اندر روگ
کام نہیں بے جھانسا پٹّی، بات نہیں بے لاگ
بھاگ مسافر بھاگ!

.

اب اُس کی صحت تیزی سے گِر رہی تھی. قلب کا عارضہ تھا جو رہ رہ کر پریشان کرتا تھا. 1942 میں جب وہ جُونا گڑھ میں مُقیم تھا، شدید تر دورہ پڑا. اب بلڈ پریشر کا عارضہ بھی شروع ہو گیا تھا.
ہندوستان کی آزادی اور اُس کے نتیجہ میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات نے اُس کی صحت پر بُرا اثر ڈالا تھا.
انسانیت کا درس دینے والے اُس شاعر نے جب انسانوں کو قتل ہوتے دیکھا تو بیمار پڑ گیا. اذیّت اور مایوسی نے اُسے دبوچ لیا.
بیماری کے ساتھ ساتھ وہ شدّت سے تنہائی محسوس کرنے لگا تھا. دوست احباب پاکستان چلے گئے تھے. اب اُس کے نغمے تھکن بانٹنے لگے تھے.

.

اب کوئی تیر دل کے پار نہیں
اب مجھے زندگی سے پیار نہیں

اب کوئی رُوح کی پُکار نہیں
اب کوئی جیسے انتظار نہیں

اب کوئی غم نہیں طرب افزا
اب کوئی درد خوش گوار نہیں

زخم سینے پہ آج بھی ہے جگر
ناز پروردہِ بہار نہیں

.

اُس نے بھی دوسرے بہت سوں کی طرح آزادی کے سُہانے خواب دیکھے تھے. لیکن دورِ جمہوریت میں اُس خواب کی تعبیر اُس کے حسبِ منشا سامنے نہیں آئی. وہ بہت سے دوسروں کی طرح اُس صورتِ حال سے مصالحت نہیں کر سکتا تھا.
خاموش رہنے کی قیمت وصول نہیں کر سکتا تھا.
اُس نے ہندوستان کے یومِ جمہوریہ کے موقع پر لال قلعہ دہلی کے ایک مشاعر ے میں جواہر لعل نہرو کی موجودگی میں اپنی نظم "آوازیں" پڑھ کر سب کے کان کھڑ ے کر دیے تھے.

.

اگرچہ آزادیِ وطن کو گزر چکا ایک سالِ کامل
مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے نا سازگار اب بھی

خود اپنی بد نیّتی کے ہاتھوں بُر ے نتائج بُھگت رہے ہیں
صداقتوں سے، حقیقتوں سے وہی ہے لیکن فرار اب بھی

زمین بدلی، زمانہ بدلہ، مگر نہ بدلے تو وہ نہ بدلے
جو تنگ و تاریک ذہنیّت تھی، وہی ہے بروئے کار اب بھی

کوئی یہ چُپکے سے اُن سے پوچھے، کہاں گئے آپ کے وہ وعدے؟؟
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی

سفارشیں ظالموں کے حق میں پیامِ رحمت بنی ہوئی ہیں
نہیں ہے شائستہِ سماعت دُکھے دلوں کی پُکار اب بھی

اِسی کا ہے نام اگر ترقی، تو اِس ترقّی سے باز آئیے!
کہ خونِ مخلوق سے خدا کی زمین ہے لالہ زار اب بھی

ہمیں ملا کر بھی خاک و خوں میں نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک
ہماری خاکِ لحد کے ذرّ ے ہیں اُن کے دامن پہ بار اب بھی

جو محوِ جشنِ نظامِ نَو ہیں، پُکار کر اُن سے کہہ رہا ہوں
یہ جان ہے سوگوار اب تک! یہ دل ہے ماتم گسار اب بھی!

منافقت کی ہزار باتیں وہ سُنتے رہتے ہیں اور خوش ہیں
مگر صداقت کی صاف و سادہ سی بات ہے ناگوار اب بھی

نہ وہ مروّت، نہ وہ صداقت، نہ وہ محبّت، نہ وہ شرافت
رہینِ خوف و خطر ہیں یعنی سُکون و امن و قرار اب بھی

زبان و دل میں نہ ربطِ صادق، نہ باہمی وہ خلوصِ کامل
جو تھے غلامانہ زندگی میں، وہی ہیں لیل و نہار اب بھی

غلط یہ جمہوریت کے دعوے، دروغ یہ زندگی کے نقشے
دلیل اِس کی یہی ہے کافی کہ ذہن ہے تنگ و تار اب بھی

یہ جشنِ آزادیِ وطن ہے! مگر اِسی جشن و سر خوشی میں
بہت ہیں سینہ فگار اب بھی، بہت ہیں بے روزگار اب بھی

گرانیاں اُس طرف وہ ارزاں، اِدھر یہ افلاس و تنگ دستی
مگر حکومت کا ہے یہ عالم، ذرا نہیں شرمسار اب بھی

یہ رشوتوں کی، یہ سازشوں کی، یہ نفع اندوزیوں کی لعنت
وہ خود ہی انصاف سے یہ کہہ دیں، نہیں وہ کچھ ذمّہ دار اب بھی؟؟

کہاں کی دلداری و محبّت؟ تلافیوں کا تو ذکر ہی کیا؟؟
حقوق پامال کر رہے ہیں، حقوق کے پہرہ دار اب بھی

وسیع مسلک، رفیع فطرت، خلوصِ ایماں، خلوصِ نیّت
اِنھیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا اِنحصار اب بھی

زمانہ کیا کیا نہ کہہ چکا ہے! زمانہ کیا کیا نہ کہہ رہا ہے!
مگر وہ ہیں وضع دار ایسے، ذرا نہیں شرمسار اب بھی

کبھی کبھی غور کرتے رہئیے، جگر کا مصرع یہ پڑھتے رہئیے
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر، چمن کی رُوٹھی بہار اب بھی

جگر کی ہے زندگی محبّت، نہیں ہے اُس کو کسی سے نفرت
جگر کے دل میں ہے سب کی عزّت، جگر ہے یاروں کا یار اب بھی
.
.
اُس نے جہاں ضرورت محسوس کی اہلِ اقتدار کو بھی لتاڑا اور بے حِس انسانوں کو بھی توجّہ دلائی.
.
.
اُٹھو اُٹھو! کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے
بڑھو بڑھو! کہ چار سُو پُکار ہی پُکار ہے

وہ وقت ہے کہ علمِ حق ہے علمِ شیطنت میں گم
وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

کہاں کے مُطرب و غزل؟ کہاں کے شاہد و چمن؟
کہ زندگی تمام تر بساطِ کار زار ہے

غضب کی چھائی جا رہی ہیں ظلمتوں کی بدلیاں
ستم کہ زد میں آندھیوں کی شمعِ روزگار ہے

زمیں کو روندتے ہوئے، صفوں کو چیرتے ہوئے
بڑھے چلو! بڑھے چلو! یہ وقت کی پُکار ہے
(نوائے وقت)

.

کدھر ہے تُو اے جراءتِ باغیانہ
بدل دے مُقدّر، پلٹ دے زمانہ

کُھلا بابِ زنداں تو کیا اِس سے حاصل؟
کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ

محبّت اُڑی جا رہی ہے دلوں سے
حقیقت بنی جا رہی ہے فسانہ

شرافت کا معیار، افراطِ دولت
صداقت کی معراج، لفظی ترانہ

زبانوں پہ اصلاحِ قومی کے نعرے
مگر طینتیں بیشتر مُفسدانہ

غریبوں پہ جو کچھ گزرتی ہے، گزرے
سِمٹ آئے جیبوں میں لیکن خزانہ

دلائل کہ ہنگامہ آرائیوں میں
کہیں رُوح بسمل، کہیں دل نشانہ

نتائج سے بھی آنکھ کُھلتی نہیں ہے
ہر اقدام اب تک ہے نا منصفانہ

بشر کی یہ پستی! ارے توبہ توبہ!
زمانے کا آقا، غلامِ زمانہ

(زمانے کا آقا، غلامِ زمانہ)

.

کہیں اُس نے ساقی کو مخاطب کر کے یوں کہا

.

کہاں سے بڑھ کے پہنچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی نہ من ساقی

یہ سُنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ! چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

سلامت تُو، ترا میخانہ، تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

رگ و پے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی

کبھی میں بھی تھا شاہد در بغل، توبہ شکن مے کش
مگر بننا ہے اب خنجر بکف، ساغر شکن ساقی

نہ لا وسواس دل میں، جو ہیں تیر ے دیکھنے والے
سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

جو دشمن کے لیے بھی سر سے اپنے کھیل جاتے ہیں
دلِ خُوباں میں چُبھتا ہے اُنہیں کا بانکپن ساقی

تر ے جوشِ رفاقت کا تقاضہ کچھ بھی ہو، لیکن
تجھے لازم نہیں ہے ترکِ منصب دفعتاً ساقی

ابھی ناقص ہے معیارِ جُنون و نظمِ مے خانہ
ابھی نا معتبر ہے تیر ے مستوں کا چلن ساقی

وہی انساں جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

لباسِ حُریّت کے اُڑ رہے ہیں ہر طرف پُرز ے
بساطِ آدمیّت ہے شکن اندر شکن ساقی

مجھے ڈر ہے کہ اِس ناپاک تر دورِ سیاسی میں
بگڑ جائے نہ خود میرا مذاقِ شعر و فن ساقی

کہیں مُلحد نہ بن جائیں مر ے افکارِ سنجیدہ
کہیں مرتد نہ ہو جائے مرا ذوقِ سُخن ساقی

کہیں خود حُسن رہ جائے نہ قومی مِلکیت بن کر
کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدودِ وطن ساقی

عجب کیا ہے یہ بہکی بہکی باتیں رنگ لے آئیں

بہت با ہوش رہتا ہے مرا دیوانہ پن ساقی

نمودِ صبحِ کاذب ہی دلیلِ صبحِ صادق ہے
اُفق سے زندگی کی دیکھ وہ پُھوٹی کرن ساقی!

(ساقی سے خطاب)

.

دنیا اُسے محض لب و عارض کا ترجمان سمجھ کر نظر انداز کر دیتی تو بڑی زیادتی ہوتی. اُس نے ایک ذمّہ دار شاعر کا فرض ادا کرتے ہوئے خود کو تاریخ میں محفوظ کر لیا. اُس کی نظمیں، اُس کی شاعری کا روشن ترین باب بن گئیں. اُس نے اپنی شاعری کو اُس مقام تک پہنچا دیا جہاں وہ سستہ نشہ نہیں بنی، سوزِ یقین اور جوشِ عمل کا پیغام بن جاتی ہے. ایسا اِس لیے ہو سکا کہ شاعری اُس کے ذاتی خلوص سے پیدا ہوئی. اُس میں نہ کسی تقلید کا رنگ ہے نہ کسی مخصوص مکتبِ خیال کے نظریات.

اپنی تمام تر حُبّ الوطنی کے باوجود وہ سچ کہنے سے کبھی باز نہیں آیا. اُس نے کبھی کسی مصلحت کو آڑے نہیں آنے دیا. اُس نے نہایت اہم شخصیت ہونے کے باوجود اپنی آواز چُھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی.
آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جو گزر رہی تھی، اُس کا اُسے شدّت سے احساس تھا.
"ہندوستان میں مسلمان جن حالات سے گزر رہا ہے، اُس کی نزاکتوں کا احساس اِس شدّت سے کر رہا ہوں کہ بیان نہیں کِیا جا سکتا."
یہ اُس کا جذبہِ درد مندی ہی تھا کہ اُس نے اپنی خواہش کے برعکس پاکستان آنا گوارا نہیں کِیا.
"اگر تمام صاحبِ رسوخ مسلمان پاکستان چلے گئے تو بے سہارا مسلمانوں کا کیا ہوگا!"
وہ خود کو ایسا با اثر آدمی سمجھتا تھا جو مسلمانوں کے حق میں آواز اُٹھا سکتا تھا اور اُس کی آواز سُنی جاتی.
مسلمان اور اُردو زبان اُس کا پسندیدہ مُقدّمہ تھے. اِن دونوں کے خلاف جو بھی زیادتی ہوتی، وہ بیانگِ دہل اِس کے حق میں بولتا تھا.
اُردو کے بار ے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اُس نے ایک انٹرویو میں کہا.
"جہاں نا معقولیت کا دور دورہ ہو، وہاں کوئی معقول بات کہنا یا کسی معقولیت کا مطالبہ کرنا سب سے بڑی نا معقولیت سمجھی جاتی ہے."

.

وہ کہیں ہو، کسی جگہ ہو، کسی حال میں ہو، کسی کی حق تلفی اُس سے برداشت نہیں ہوتی تھی. اُس وقت تک اُسے چین نہیں آتا تھا جب تک وہ اُسے حق دلا نہ دے.
1950 میں وہ پاکستان آیا. عبد الرب نشتر کی گورنری کا زمانہ تھا. جگر لاہور میں ٹھہرا ہوا تھا. پرستار جوق در جوق اُس سے ملنے کے لیے آ رہے تھے. اُن میں ایک صاحب ایسے بھی تھے جن کے متعلق جگر کو معلوم ہوا کہ اُن کی تعلیمی قابلیت پی ایچ ڈی ہے.
"آپ کسی تعلیمی درسگاہ سے منسلک ہوں گے؟" جگر نے پوچھا.
"ارے نہیں جگر صاحب. میں تو محکمہ آبادی میں ملازم ہوں." اُس شخص نے جواب دیا.

"واہ! یہ کیا بات ہوئی؟ آپ پی ایچ ڈی ہیں اور محکمہ آبادی میں ملازمت؟"
"بس جناب وہاں ایک آسامی خالی تھی، میں نے کہا چلو یہی سہی."
"شکر ہے، کہیں گھاس کاٹنے والے کی آسامی خالی نہیں تھی. ورنہ آپ کہتے چلو یہی سہی."
وہ شخص شرمندہ ہو گیا. "بات یہ ہے جگر صاحب کہ میر ے پاس کوئی سفارش نہیں تھی."
"پاکستان میں بھی سفارش کی ضرورت!! کمال ہے صاحب. آپ کل میرے پاس تشریف لائیے. آپ کو تو کسی تعلیمی ادارے میں ہونا چاہئیے."
اُس شخص سے جگر کی جان پہچان تک نہیں تھی لیکن اُس کی حق تلفی ہوئی تھی. جگر بے چین ہو گیا. اُس کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک یہی کہتا رہا. "واہ صاحب واہ! پی ایچ ڈی اور محکمہ آبادی میں ملازمت، نہیں صاحب نہیں. یہ تو ظلم ہے."
"نشتر صاحب کو فوراً فون کیجئے." اُس نے اپنے میزبان سے کہا. "اُن سے کہئیے جگر آپ سے ملنا چاہتے ہیں."
میزبان نے فون کِیا. نشتر صاحب نے دوسرے دن شام کی چائے پر جگر کو مدعو کر لیا.
جگر اپنے دوستوں کے قافلے کے ساتھ نشتر سے ملنے پہنچ گیا. اُن میں وہ شخص بھی تھا جس کے کام کے سلسلے میں وہ ملنے آیا تھا.
نشتر صاحب ایسے تپاک سے ملے جیسے جگر گورنر ہو اور نشتر محض ایک شاعر.
باتوں کا سلسلہ دراز ہوا. چائے بھی پی گئی. جگر نے وہ بات ہی نہ نکالی جس کے لیے وہ آئے تھے. دراصل یہاں آنے کا سبب ہی بُھول گیا تھا. بُھول جانے کی عادت اُس کی پُرانی تھی.
اُسے کسی نے یاد دلایا اور اُسے یاد آ گیا. زیرِ لب اپنی عادت پر لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا پھر نشتر سے مُخاطب ہوئے.
"صاحب آپ کے محکموں میں کیا ہو رہا ہے. یہ صاحب پی ایچ ڈی ہیں. کسی درسگاہ میں ہوں تو کتنے لوگوں کا بھلا ہو، لیکن انہیں محکمہ آبادی میں رکھا ہوا ہے."
نشتر صاحب زیرک آدمی تھے. فوراً سمجھ گئے کہ بات کیا ہے. جگر کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی.
"بس جگر صاحب، میں پوری بات سمجھ گیا. آپ تردّد چھوڑ دیں. اب یہ میری ذمہ داری ہے."
یہی ہوا بھی، جگر ابھی پاکستان سے واپس جانے نہیں پایا تھا کہ اُس شخص کو ایک کالج میں نوکری مل گئی.

.
عبد الغفور شاہ نقشبندی کے بھتیجے حجِ بیت اللہ کو تشریف لے گئے تھے. وہاں اُنہوں نے ایک خواب دیکھا. ایک صاحب چارپائی پر بیٹھے ہیں. بکھر ے بال، پریشان آنکھیں. اہلِ مدینہ کا مجمع ہے اور وہ صاحب جُھوم جُھوم کر اشعار پڑھ رہے ہیں. خواب دیکھنے والا دل میں سوچ رہا ہے کہ جانے یہ کون صاحب ہیں جن کی ایسی پزیرائی ہو رہی ہے.
اشعار پڑھنے کے بعد وہ شخص روزۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہتا ہے "یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کچھ مجھے بھی اپنی رحمت کا صدقہ عطا ہو."
اب خواب دیکھنے والے سے رہا نہیں جاتا. وہ کسی سے پوچھتا ہے، یہ صاحب کون ہیں؟ یہ ہندوستان کے مشہور شاعر جگر مراد آبادی ہیں. جواب ملتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی خواب دیکھنے والے کی آنکھ کُھل جاتی ہے.

جب وہ صاحب ہندوستان واپس آئے تو اُنہوں نے یہ خواب اپنے چچا کو سُنایا. خواب کی تعبیر ظاہر تھی. جگر کا بُلاوا آ گیا تھا.

.

عبد الغفور شاہ نقشبندی فوراً جگر کے پاس پہنچے. جگر اُس وقت کسی غزل کو بیاض پر اُتار رہا تھا. شاہ صاحب کو دیکھتے ہی ادب سے کھڑا ہو گیا. اُس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن شاہ صاحب نے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا اور فرطِ عقیدت سے ماتھا چُوم لیا.
"اللہ الغنی! کیا مرتبہ ہے! کیا مقام ہے!"
"شاہ صاحب کیوں شرمندہ کرتے ہیں. بات کیا ہے؟"
"مبارک ہو. اللہ اکبر! کیا مرتبہ ہے! کیا مقام ہے!"
"شاہ صاحب آپ کا حُسنِ نظر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو رہا ہے. مجھ گنہگار سے ایسی کیا نیکی سر انجام پا گئی؟"
"میاں تسلّی سے بیٹھو تو کچھ عرض کروں."
اُنہوں نے وہ خواب جگر کو سُنایا جو اُن کے بھتیجے نے دیکھا تھا.
جگر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے. شدّتِ جذبات سے جسم کانپ رہا تھا.
"میں اور وہ دربار! شاہ صاحب، دعا فرمائیے کہ یہ خواب سچّا ہو."
"بس آپ تیاری کریں. مجھے یقین ہے، آپ کو بُلاوا آ گیا ہے."

.

وہ عشق ہی نہیں، وہ دل ہی نہیں جگر
لبّیک خود کہا نہ جسے حُسنِ یار نے

.

اُس رات جگر کی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی. اُسے اپنا دورِ مُصیبت یاد آ رہا تھا. میں ہرگز اِس قابل نہیں ہوں. ہاں مگر اُس طرف سے کرم ہو جائے تو بعید بھی نہیں.

.

مری طلب بھی اُسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں، اُٹھائے جاتے ہیں

.

اُسے اُس خواب اور اُس کی تعبیر پر اِتنا یقین تھا کہ اُس نے تیاری شروع کر دی. پھر جیسے رات بیتی، صبح ہونے لگی. ایسے وسائل مہیّا ہونے لگے کہ بالآخر خواب، حقیقت بن گیا.
جگر حج پر جا رہا ہے!
شیروانی کی جیب میں شراب کی بوتل رکھ کر ایک مجذوب سے حُلیے کا آدمی جسے یاد تھا، اُسے تعجّب ہوا. پھر یہ تعجّب یقین میں بدل گیا کہ سچّے دل سے توبہ کی جائے تو قبول ضرور ہوتی ہے.
جگر بمبئی گئے ہیں. وہاں سے حج پر جائیں گے. وہ اکیلے نہیں ہیں. حج پر بھی اُن کے احباب کا قافلہ اُن کے ساتھ ہے.
سعودی حکومت کو بھی معلوم ہو گیا کہ شاعرِ ہندوستان حج کے لیے تشریف لا رہے ہیں.
جدّہ کی بندرگاہ پر سعودی حکومت کے افسران اُس کے استقبال کے لیے موجود تھے.
"آپ شاہی مہمان ہیں. بادشاہ کی طرف سے آپ کے لیے دعوت نامہ ہے."

"میں اکیلا نہیں ہوں. میر ے ساتھ کچھ اور بھی لوگ ہیں."
"آپ انتظار فرمائیں. اُن کے دعوت نامے بھی تیّار ہو جائیں گے."
"شکریہ! ہمار ے قیام کا انتظام ہے؟"
"حریمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اصطفا منزل میں قیام ہوگا. ہندوستان سے چلتے وقت ہی انتظام ہو گیا تھا."
بابرکت دن اور مقدّس راتیں ذکر و فکر میں گزارے لیکن یہاں آ کر جانے کو جی کس کا چاہتا ہے! واپسی کی گھڑیاں جُوں جُوں قریب آ رہی تھیں. وہ بھی یہی سوچ رہا تھا. کاش! کچھ دن اور . ..
ہندوستان سے آئے ہوئے حاجیوں کی عبادات میں ایک عبادت یہ بھی شامل تھی کہ جسے معلوم ہوتا تھا جگر آئے ہیں، وہ اُس کی زیارت کے لیے اصطفا منزل پہنچ جاتا تھا. اُس دربارِ اقدس میں نوابوں کی بھی وہ پزیرائی نہیں ہوئی ہوگی جو اُس کی ہو رہی تھی.
ایک دن ایک صاحب اُس سے ملنے آئے اور یہ سوچ کر کہ یہ شاعر ہیں، خوش ہوں گے، خواہش ظاہر کی کہ وہ جگر کے سامنے نعت پڑھنا چاہتے ہیں. جگر خود تو نعت کہتا نہیں تھا لیکن سُننے کا بے حد شوق تھا. اُس نے اِس سعادت کے لیے دامن پھیلا دیا.
نعت ایسی پُر اثر تھی اور وہ صاحب ایسے خوش الحان (پیاری آواز والے) تھے کہ جگر کی محویت بے ہوشی کی حد تک پہنچ گئی. قریب ہی چائے کے لیے پانی گرم ہو رہا تھا. اُس کا پاؤں لگا اور کھولتا ہوا پانی اُس کی ٹانگ پر گر گیا. اُس کی محویت نے احساس بھی نہیں ہونے دیا لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ پوری ٹانگ بُری طرح سے جل گئی ہے.
اُسے ٹانگ کے علاج کے بہانے 29 دن مزید مہمان رہنا پڑا. وہ خوش تھا کہ اِسی بہانے کچھ اور دن اُس کا وجود اِس زمین پر رہے گا.
.
دل کی ہر چیز جگمگا اُٹھی
آج شاید وہ بے نقاب ہوا

ستمِ خاص یار کی ہے قسم
کرمِ یار بے حساب ہوا
.
فضل احمد کریمی نے اپنی فلم "آسمانی مشاعرہ" کے نام سے بنانی شروع کی. اُس میں ایک تمثیلی مشاعرہ پیش ہونا تھا. اُنہوں نے یہ جدّت پیدا کی کہ اداکاروں کی بجائے نامور شاعروں اور ادیبوں کو مرحوم شعرا کے رُوپ میں پیش کِیا جائے. داغ دہلوی کا کردار ادا کرنے کے لیے جگر کو منتخب کِیا گیا. جگر کو آمادہ کرنے کے لیے فضل احمد کریمی خود اُس کے پاس آئے.
"کمال ہے صاحب! اب میں فلموں میں کام کروں گا؟"
"یہ اداکاری نہیں ہے جگر صاحب. آپ کو تو ایک مشاعرہ پڑھنا ہے."
"میں کسی ایسے مشاعرے کو نہیں مانتا جو فلم کے پردے پر چلے."
"وہ آپ نہیں ہوں گے. آپ تو داغ کی نمائندگی کر رہے ہوں گے. پردے پر تو داغ چل رہے ہوں گے."
"پھر آپ کسی کو بھی داغ بنا دیجئے. میں ہی کیوں؟"
"صرف اِس لیے کہ اِس طرح یہ فلم حقیقت سے قریب تر ہو جائے گی."

غرض بڑی بحث و تمحیص کے بعد جگر کو قائل کر لیا گیا۔
اُس نے بڑی کامیابی سے داغ کا کردار ادا کِیا۔ داغ کا حُلیہ اُس پر خوب سج رہا تھا۔
اُس فلم میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے الطاف حُسین حالی کا کردار ادا کِیا تھا۔
یہ فلم مکمّل نہیں ہو سکی اور پھر اُس کے نیگیٹو بھی ضائع ہو گئے، ورنہ یہ تمثیلی مشاعرہ یادگار ہوتا۔

.

1957 میں ایک مرتبہ پھر وہ پاکستان آیا۔ دل کے کئی دور ے پڑ چکے تھے۔ اور بھی کئی بیماریاں لاحق ہو چکی تھیں۔ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ پُرانے دوستوں سے ملا، نئے شعرا سے متعارف ہوا تو پھر پہلے جیسا جگر نظر آنے لگا۔
وہی ہشاش بشاش چہرہ، خوش و خرم، تازہ دم۔
جگر آئے ہیں! دوستوں نے رات کو دن بنا دیا۔ نشستیں، مشاعرے، دعوتیں، راتوں کو جاگنا۔
حیدر آباد (سندھ) پہنچا تو تھکن سے نڈھال تھا۔ حیدر آباد سے نواب شاہ کے مشاعرے میں جانا تھا۔
حیدر آباد میں قابل اجمیری کے رنگِ شاعری کا وہ قتیل تھا۔ اُسے معلوم ہوا کہ قابل بیمار ہے اور تنگ دست تو ہے ہی۔ وہ قابل کو دیکھنے گیا۔
اُٹھتے وقت اُس نے اپنا بٹوا قابل کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ قابل کو بہت دیر تک یہ نشہ رہا کہ جگر صاحب اُسے دیکھنے آئے۔ کسی وقت اُس نے تکیہ اُٹھایا تو بٹوا نظر آیا۔ یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہیں لگی کہ بٹوا خود جگر صاحب جان بُوجھ کر چھوڑ گئے ہیں تاکہ میں اُن کی مدد قبول کروں۔ اُن کی مروّت بھی برقرار رہے اور میری عزّتِ نفس کو دھچکا نہ پہنچے۔ پھر قابل نے سوچا، وہ تو خود مسافر ہیں۔ مشاعروں سے جو آمدنی ہوئی ہوگی، میر ے سُپرد کر دی۔ اُن کی محبّت اپنی جگہ لیکن مجھے یہ ہرگز قبول نہیں ہوگا۔
اُس نے اُسی وقت بٹوہ یہ کہہ کر واپس کروا دیا کہ شاید آپ بُھول کر آ گئے تھے۔ جگر یہ کہہ کر قابل کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ بٹوہ جان بُوجھ کر چھوڑ آیا تھا۔ اُس نے بٹوہ لیا اور خاموشی سے جیب میں رکھ لِیا۔

.

نواب شاہ کے مشاعرے کے بعد اُسے دل میں تکلیف محسوس ہوئی۔ ایک دوا وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ اُس کے استعمال سے کچھ افاقہ ہوا۔ اِتنا ہو گیا کہ وہ واپسی کا سفر طے کر سکے۔ دن بھر گزارنے کے بعد شام کو حیدر آباد آ گیا۔
نومبر کا مہینہ تھا۔ 9 نومبر کو ملتان میں مشاعرہ تھا، مگر وہ بیمار تھا۔ ملتان والوں نے مشاعرہ ملتوی کر دیا۔ نئی تاریخ 16 نومبر مقرّر ہوئی۔
اُس کی طبیعت بحال ہو گئی تھی۔ لیکن 14 نومبر کو حالت پھر بِگڑ گئی۔ ڈاکٹر نے انجیکشن لگائے۔
طبیعت بحال ضرور ہو گئی مگر ایسی نہیں تھی کہ ملتان تک کا سفر کرے۔ دوستوں نے بھی مشورہ دِیا کہ معذرت کر لے۔
"نہیں صاحب، یہ بد عہدی ہوگی۔ میں وعدہ کر چکا ہوں۔ میری خاطر اُن لوگوں نے مشاعرہ ملتوی کر دیا۔ اب میں پھر اُن سے معذرت کر لوں؟"
اُس نے اُسی حالت میں ملتان تک کا سفر کِیا۔

10, 12 مشاعروں میں شرکت سے 10،12 ہزار روپے کمائے لیکن زرِ مبادلہ کی خراب حالت کی وجہ سے بہ مشکل 2500 روپے کا ڈرافٹ مل سکا. یہ گورکھ دھندہ اُس کی سمجھ سے بالا تر تھا مگر ناراض ہونے کے سِوا کیا کر سکتا تھا.
کسی نے مشورہ دِیا کہ ملتان کے مشاعرے سے جو رقم ملی ہے اُس سے سونے کے بٹن بنوا لو، فائدے میں رہو گے.
.
پاکستان سے واپس آنے کے بعد وہ میرٹھ میں تھا کہ 3 جنوری 1958 کو دل میں درد اُٹّھا. اُسے میرٹھ سے لکھنؤ لایا گیا جہاں جارج میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا. تشخیص سے معلوم ہوا کہ دل کا ایک حصّہ بڑھ گیا ہے.
مئی 1958 میں لکھنؤ سے گونڈہ آ گیا.
3 دسمبر 1958 کو ریڈ کراس کے مشاعرے کے لیے پاکستان بُلایا گیا لیکن اب وہ اِس قابل نہیں رہا تھا کہ جا سکتا. 8،10 مہینوں میں 10،15 دور ے پڑ چکے تھے. اُس نے معذرت کر لی.
.
8 جنوری 1959 کو لکھنؤ میں پھر شدید دورہ پڑا. سِوَل سرجن دیکھنے کے لیے آیا تھا. ذرا طبیعت سنبھلی تو ڈاکٹر نے فرمائش کی.
"جگر صاحب، میری فیس یہ ہے کہ آپ مجھے غزل سُنائیں."
"بھائی جس دل پہ ناز تھا وہ دل ہی نہیں رہا. بہر حال تم کہتے ہو تو انکار بھی نہیں کر سکتا."
اُس کی آنکھیں بند تھیں. تصوّر کیا خبر کس کا تھا. اِک سوز تھا کہ ساز بن کر غزل میں ڈھل گیا.
اُس نے ترنّم کے پُھول نچھاور کرنے شروع کِیے.
.
دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبّت کے سِوا یاد

میں شکوہ بہ لب تھا، مجھے یہ بھی نہ رہا یاد
شاید کہ مر ے بُھولنے والے نے کِیا یاد

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جُنوں کو
جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش
اُس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سِوا یاد

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے
اب تک ہے وہ اِک نغمۂ بے ساز و صدا یاد

کیا لُطف! کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجیے کوئی بُھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

میں ترکِ رہ و رسمِ جُنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد

مدت ہوئی اِک حادثہِ عشق کو لیکن
اب تک ہے تر ے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد
.
اُس کی حالت پھر سنبھل گئی لیکن اب اُس کے چاہنے والوں کو تشویش ہونے لگی تھی.
.

اُس کا مجموعہِ کلام "آتشِ گُل" نیا نیا آیا تھا. ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے اُسے مجموعہ کلام پر 5000 کا انعام دیا گیا. حُصولِ انعام کے لیے اُسے دہلی جانا پڑا. بُلبُل کی طرح چہکنے والا آج بہت خاموش تھا. نقاہت اور بیماری کے آثار اُس کے چہرے پر ظاہر تھے. اُس کے پرستاروں نے اُس کی گردن پُھولوں سے ڈھانپ دی.
اِس پزیرائی نے اُسے ایک مرتبہ پھر تازہ دم کر دیا. اِتنا تازہ دم کہ اپریل 1959 میں ہونے والے جشنِ میر کے مشاعرے میں شریک ہونے بمبئی پہنچ گیا.
ہندوستان کا کون سا ایسا قابلِ ذکر شاعر تھا جو اُس مشاعرے میں نہیں تھا! لیکن جگر، جگر تھا. ہر آنکھ اُسی کا طواف کر رہی تھی. اُس کی بیماری کی خبریں چھپتی رہتی تھیں. اِس لیے عوام اُسے اپنے درمیان دیکھ کر جشنِ میر کو جشنِ جگر سمجھ کر خوش ہو رہے تھے.
اب اُس سے پڑھا نہیں جاتا تھا. لیکن سُننے والوں کو مایوس کرنا بھی اُس کی غیرت کے خلاف تھا. وہ بہت دیر سے اپنے پرستاروں پر نچھاور کرنے کے لیے سانسیں جمع کر رہا تھا. پھر اُس نے اُن سانسوں کو غزل کا رُوپ د ے کر نذرِ دوستاں کر دیا.
.
طبیعت اِن دنوں بیگانہِ غم ہوتی جاتی ہے
مر ے حصّے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

قیامت کیا یہ ا ے حُسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ محفل تو وہی ہے، دلکشی کم ہوتی جاتی ہے

وہی میخانہ و صہبا، وہی ساغر، وہی شیشہ
مگر آوازِ نوشا نوش مدھم ہوتی جاتی ہے

وہی ہے شاہد و ساقی، مگر دل بُجھتا جاتا ہے
وہی ہے شمع، لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے

وہی ہے زندگی لیکن جگر یہ حال ہے اپنا
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

.
جوہو کے کنار ے نہایت شاندار بنگلے میں اُس کا قیام تھا. بہت دن بعد بمبئی آیا تھا اِس لیے دوستوں کے لیے نعمت بنا ہوا تھا. مشاعرے اور محفلیں خوب سج رہی تھیں.
خلافت ہاؤس میں ڈنر تھا. عمائدینِ شہر، اہلِ اقتدار اور شعرا کا مجمع تھا. جگر گویا میرِ محفل تھا.
ڈنر کے بعد موسیقی کی محفل آراستہ ہوئی. آغاز جگر کی ایک غزل سے ہوا.
محفل عروج پر تھی کہ جگر کا دل بے قابو ہو گیا. شدید دورہ پڑا تھا. محفل برہم ہو گئی.

بمبئی بڑا شہر تھا. پھر اُس وقت تمام وسائل مہیّا تھے. اُسی وقت طبّی امداد مل گئی. ایک مرتبہ پھر چراغ نے بُجھتے بُجھتے سنبھالا لے لیا.
4 اگست 1959 کو وہ بمبئی سے گونڈہ پہنچا لیکن اِس حال میں کہ انتہائی درجے کی نقاہت طاری تھی اور پیروں میں ورم تھا. زندگی بھر کی شراب نوشی نے جگر اور گردوں کو بھی متاثر کِیا تھا. بُھوک ختم ہو کر رہ گئی تھی. زندگی بھر گھومتا رہا تھا. اِس کی سزا یہ ملی کہ پاؤں مُتورم ہو گئے. لہٰذا آرام کے سوا کیا ہو سکتا تھا. ستم بالائے ستم کہ آنکھوں میں موتیا اُتر آیا تھا.

.
لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر مشاعرہ تھا لیکن اب وہ کیسے جا سکتا تھا! مشاعرے میں اُس کی شرکت ضروری بھی تھی کہ نہ جانے کب یہ آواز خاموش ہو جائے. ریڈیو کا عملہ گونڈہ آیا اور اُس کی تازہ غزل اُس کی آواز میں ریکارڈ کر لی.
لکھنؤ ریڈیو سے مشاعرہ نشر ہوا. آخری شاعر کی حیثیت سے اُس کی ریکارڈ شدہ غزل سُنوائی گئی.
"حضرات، حضرت جگر مراد آبادی علالت کے باعث اسٹوڈیو میں تشریف نہ لا سکے لیکن اُن کی غزل، اُنہی کی آواز میں ہم تک پہنچ گئی. جسے ہم نذرِ سماعت کر رہے ہیں." اِس اعلان کے ساتھ ہی جگر کی مترنّم آواز نے ماحول کو سوگوار کر دیا.

.
جان کر مِنجملہءِ خاصانِ مے خانہ مجھے
مُدّتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

ننگِ مے خانہ تھا میں، ساقی نے یہ کیا کر دیا!
پینے والے کہہ اُٹھے "یا پیرِ مے خانہ" مجھے

سبزہ و گل، مو ج و دریا، انجم و خورشید و ماہ
اِک تعلق سب سے ہے لیکن، رقیبانہ مجھے

زندگی میں آ گیا جب کوئی وقتِ اِمتحاں
اُس نے دیکھا ہے جگر بے اِختیارانہ مجھے
.
کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اِس غزل کو سُن کر اشکبار نہ ہوئی ہو. غزل کیا تھی! جانے والے کا الوَداعی سلام تھا.

ریڈیو بند ہو گیا تھا لیکن بڑی دیر تک جگر کی آواز آتی رہی

.

مُدّتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

.

9 ستمبر 1960 کی رات نے اُسے گہری نیند سُلا دیا. صبح تقریباً 4 بج کر 30 منٹ پر گھبراہٹ سے آنکھ کُھلی. چائے کی فرمائش کی.
نسیم تو رات بھر جاگتی ہی رہتی تھیں. چائے کا حکم ہوا تو چائے بنا کر لے آئیں.
چائے پیتے اور باتیں کرتے ہوئے کچھ وقت اور گزر گیا.
"وقت کیا ہوا ہے؟"
"ساڑھے پانچ."
"تاخیر ہو رہی ہے." تھوڑی دیر بعد کہا. "میں زیادہ سے زیادہ 10 بجے تک کا مہمان ہوں."
نسیم نے گھبرا کر جگر کے بھائی مظفر کو جگا دیا.
ڈاکٹر کو بُلا لاتے، تاکہ تم کو تسلّی ہو جاتی." جگر نے کہا.
مظفر صاحب ڈاکٹر کو بُلانے گئے. ابھی ڈاکٹر نہیں آیا تھا کہ دو ہچکیاں لیں اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا.

.

ہاں سزا د ے اے خدائے عشق! اے توفیقِ غم
پھر زبانِ بے ادب پر ذکرِ یار آ ہی گیا

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا.

(ختم شد)